مرزا رسوا

از

عزیز لکھنوی

و اکیڈمی سندھ کراچی

مرزا ہادی رُسوا

از

حضرت عزیز لکھنوی

مرتب

سید ابوالخیر کشفی

اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی

مشاہیر اردو کا سوانحی سلسلہ

بیادگار

طاہرہ کشفی

بار اوّل ـ ۱۹۸۵ء

طابع ـ عزیز خالد

کتابت ـ عبدالواحد واحدی

مطبع ـ اکیڈیمک آفسٹ پریس
آرام باغ روڈ، کراچی

حرفِ آغاز

میں نے اور طاہرہ نے ایک ساتھ کتنے خواب دیکھے تھے ہم ایک دوسرے کے محتسب بھی تھے اور اپنی زندگی، اپنے ادب اور اپنے معاشرہ کا احتساب بھی کرتے تھے۔ پہلے ہم اپنے آپ کو بدلنا چاہتے تھے۔ تاکہ اتنے مضبوط، اتنے بڑے ہو جائیں کہ زندگی ہمارے نقوشِ قدم کے سہارے اپنا راستہ تلاش کر سکے۔

مگر طاہرہ مر گئی۔ وہ اپنے خون سے اپنی ہر ناتمامی کو رنگِ بقا عطا کر گئی۔ اب زندگی کے ویرانے ہیں اور میں ہوں ہے۔ وہ تو چلی گئی۔ جو میرے ساتھ مل کر زلفِ گیتی کو سنوارنا چاہتی تھی اور ہم دونوں اپنے خیالوں میں کس طرح کاکلِ گیتی میں افشاں بھرتے تھے،

آسان نسخہ تو یہی تھا کہ میں بھی مرنے کے لئے بہانے ڈھونڈھتا اور اس سے جا ملتا۔ مگر ہوا یوں کہ نہ جانے زندگی کی تمنا کچھ اور شدید ہو گئی ہے۔ طاہرہ نے جو کچھ سوچا تھا، جو منصوبے

بنائے تھے۔ اب زندگی سے بہت سے لمحے اسی لئے چاہتا ہوں
کہ انہیں عمل کے قالب میں ڈھال سکوں۔ وہ منصوبے تھے کیا؟

بچوں کے لئے کتب خانوں کا ملک گیر سلسلہ

ایک ایسا رسالہ جو بڑی تحریک بن سکے

اُن مشاہیر کی تاریخ کو زندہ رکھنا جنہوں نے ہمارے تمدن، تاریخ اور ادب کو وہ کچھ بنایا ہے جو آپ کو نظر آتا ہے۔ اور ان تمام مقاصد سے بلند تر وہ مقصد جو ہر لمحہ حیات کو عبادت بنا دے گا، یعنی اس نظامِ ربوبیت اور اسلامی مملکت کے قیام کے لئے عملی و نظری جدوجہد جو انسانیت کے لئے پناہ گاہ بن سکے۔

زندگی مختصر ہے اور کام بہت اور اب تو ہے

ایک ایک لمحہ کا مجھے دینا پڑا حساب

خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار ہے

سلسلہ سوانح مشاہیر کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے

(۱) مشاہیر ادب

(۲) برعظیم میں اسلام کے مفکر

(۳) سیاست داں، ماہرینِ تعلیم اور زندگی کے دوسرے شعبوں کے اکابر۔

۲۸ جون ۱۹۷۰ء

اُردو میں کتنی سوانح عمریاں اور خود نوشت سوانح عمریاں ایسی موجود ہیں جن سے اربابِ علم و نظر بھی اچھی طرح آگاہ ہیں ان میں سے بعض تحریریں ہماری صدی ہی کی ہیں، مثال کے طور پر حضرت ریاضؔ خیرآبادی کے خود نوشت حالات کو کتابی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح زیرِ نظر کتاب کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک اہم ادبی شخصیت کے حالات پر ایک اہم ادبی شخصیت کی تحریر ہے نقاش کی اہمیت نے نقش کو اہم تر بنا دیا ہے۔

میں کوشش کروں گا کہ ایسی تحریروں کو اس سلسلہ میں پیش کرتا رہوں۔ میں اپنے پڑھنے والوں سے توقع رکھتا ہوں کہ وہ ایسی تحریروں کی تلاش اور بازیافت میں میری مدد کریں گے۔

اس کتابچہ کے بارے میں شاید کسی تمہید یا تعارف کی ضرورت نہیں۔ عزیزؔ لکھنوی لکھنؤ کی غزل کی تجدید و اصلاح کے طائرانِ پیش رس میں شامل تھے۔ صفیؔ، عزیزؔ، ثاقبؔ اور محشرؔ کی خدمات ہماری ادبی تاریخ کا ایک حصّہ ہیں۔ عزیزؔ لکھنوی نے غالبؔ کے سہارے لکھنؤ کی غزل کو بلند تر سطح عطا کی۔ یہ محض اتفاق

نہیں کہ لکھنؤ کی جدید غزل کے سب سے اہم نمائندے حضرتِ اثر لکھنوی مرحوم، عزیز کے شاگرد تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ جوش ملیح آبادی کی عظمت اور شہرت اُن کے اُستاد عزیز کے مقام ادبی کا ایک اور ثبوت ہے۔

امراؤ جان ادا کے خالق مرزا رسوا کے فن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر احسن فاروقی، سید وقار عظیم اور علی عباس حسینی کے تفصیلی مطالعوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے تخلیقی مطالعہ کا حوالہ کافی ہے۔ لیکن مرزا رسوا کو صرف "مرزا" اور "پروفیسر مرزا" لکھنے والا حضرتِ عزیز کے سوا اور کون تھا یا ہے؟ مجھے تو اِس تحریر میں مرزا ہادی رسوا کے حالات پڑھتے ہوتے نہ جانے کیوں بار بار "شریف زادہ" کی یاد آئی۔ میری رائے میں عزیز لکھنوی صرف ایک مخصوص اسلوب شعر کے مالک ہی نہ تھے بلکہ نثر میں بھی اپنا ایک ڈھنگ رکھتے ہیں۔ وہ نثر میں شعر کے سے دروبست کے قائل تھے، لیکن اس طرح کہ نثر کا اپنا حُسن مجروح نہ ہو۔

مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات کو شائع کیا جا چکا ہے۔ لیکن سب سے پہلے حضرتِ عزیز ہی نے اس دولتِ ادب کی

طرف توجہ دی تھی۔

اس تحریر سے مرزا رسوا کے بارے میں جو نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں، اُن کی قدر و قیمت کا تعین آپ کا کام ہے۔ میں اس کے پس منظر کے بارے میں کچھ عرض کر دوں تو مناسب ہوگا۔ یہ طویل تحریر ۱۹۳۳ء میں رسالہ زمانہ کانپور میں کئی قسطوں میں شائع ہوئی۔ غالباً مارچ سے جولائی تک (پانچ قسطیں) والد محترم حضرت ثاقب کانپوری مدظلہٗ نے حضرتِ عزیز سے اس تحریر کو شائع کرنے کی اجازت مانگی۔ حضرت عزیز نے کئی اضافوں اور تبدیلیوں سے اس تحریر کو ہموار ترکر کے والد کو بخوشی شائع کرنے کی اجازت مرحمت کی۔ پتہ نہیں کن حالات کے تحت اِسے کتابی صورت میں نہ پیش کیا جا سکا۔ ۱۹۶۳ء میں جب میں کانپور گیا اور پرانے کاغذوں کے ہجوم میں یہ دولتِ بیدار نظر آئی۔ بدقسمتی سے میں بھی اپنی اُلجھنوں میں اِسے جناب علاؤالدین خالد کے حوالہ نہ کر سکا۔ اور آج سات سال کے بعد میں یہ آخری سطور اس عزم کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ یہ مسودہ جلد سے جلد خالد صاحب تک پہنچا دیا جائے۔

ابوالخیر کشفی

مرزا ہادی رُسوا

بیاد شش بخیر لکھنؤ کی آبادی بھی کیا آبادی تھی جہاں ہر فن کے کامل ہر علم کے ماہر گوشے گوشے میں نظر آتے تھے۔ ایک سجی سجائی محفل تھی جس میں علوم و فنون کی شمعیں روشن تھیں۔ ایک نگار خانہ تھا جس میں کمالات کے عکس نظر آتے تھے۔ اُسی آئینہ کا ایک تابناک پرتو پرُوفیسر مرزا کی ذات گرامی تھی جس کو بقیۃ السلف اور یادگار رفتگاں کہنا بیجا نہیں۔ اس ذات کا فقدان علم وادب کے لئے ایسا عظیم الشان نقصان ہے جس کی تلافی کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ حق تو یہ ہے کہ پرُوفیسر مرزا کے قلم نے نثرِ لکھنؤ کو درجۂ اعتبار عطا کیا۔ وہ لہر جو مرزا رجب علی بیگ سرورؔ، منشی رتن ناتھ سرشارؔ اور سجاد حسین مرحوم کے ذہن و قلم سے اٹھی تھی اُسے پرُوفیسر مرزا نے دریائے وسیع بنادیا۔

سالہا سال مرزا سے صحبت رہی۔ اُن کے حالات اُن کی زبانی بھی سُنے۔ رفتار و گفتار سے بھی اندازہ کیا۔ اُن کی علمی مشغولیتیں بھی دیکھیں، اُن کے کارناموں پر بھی نظر ڈالی۔ آج جب وہ صورت پردۂ خاک میں چراغِ زیرِ دامن ہے، جی چاہتا ہے کہ

ان داستانوں کو بیان کروں جن کا حرف حرف آئندہ نسلوں کے لئے شمع ترقی ہے
اس تذکرے کی اکثر باتیں مرزا صاحب کی زبان سے سُنی ہوئی ہیں۔ اکثر چشم دید
حالات ہیں اور بعض باتیں مخلص دیرینہ شیخ ممتاز حسین صاحب عثمانی ایڈیٹر
اودھ پنچ کی زبانی ہوئی ہیں جن کو مرزا صاحب سے خاص خصوصیت تھی۔

پیدائش

لکھنؤ ایک عظیم الشان شہر ہے جس میں بیشمار محلے ہیں۔ بعضوں کے
نام بھی اب لوگوں کو یاد نہیں رہے۔ انہیں محلّوں میں کوچۂ آفریں علی خاں بھی تھا جو
"باگ ڈولہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اسی محلّہ کے ایک مکان میں مرزا صاحب کی
ولادت ۱۸۵۸ء میں ہوئی۔ یہ سال عام الغدر تھا۔

سلسلۂ نسب

مرزا صاحب کا پورا نام اور سلسلۂ نسب یہ ہے۔
مرزا محمد ہادی ابن آغا محمد تقی ابن آغا ولی ابن مرزا ذوالفقار علی بیگ
اڈیٹن توپ خانہ شاہی۔ ابن مرزا رشید بیگ ابن مرزا رحیم بیگ ماژندرانی۔
جیسا کہ سلسلۂ نسب سے واضح ہو جاتا ہے مرزا صاحب کے اسلاف
ماژندران سے دلّی آئے کہ یہ شہر مغلوں کے عہد میں عروس البلاد اور جنت
ارضی تھا۔ صاحبانِ کمال اور اربابِ فنون و علم اسے کعبۂ مقصود جانتے تھے چند
مرز لک کے بزرگ دلّی میں رہے لیکن جب ہوا کا رخ بدلا۔ انتشار کا دور دورہ شروع ہوا۔

تو اس خاندان نے دلّی کو چھوڑا اور اودھ میں سکونت اختیار کی۔ آصف الدولہ کا زمانہ تھا۔ شرفا کی عزت ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ اُن کی رفاقت پر مامور ہو گئے جاگیرات عطیاتِ شاہی سب فیض آباد میں رہے اور وہیں نسیاً منسیاً ہو گئے۔ یہاں نیا راگ اور نیا باجہ پھر شروع ہوا۔

نانا، نواب احمد علی خاں عرف آغا خیر ابن حمایت علی خاں خواہر زادہ حسن رضا خاں نائب آصف الدولہ۔ نانی طبا طبائی خاندان سے تھیں، برادر مختار الدولہ کی اولاد سے جن کا سلسلہ سادات سے ملتا ہے۔ طبا طبائے[1] خاندان کا مفصل ذکر حبیب السیر میں ہے۔ اسی خاندان میں سلیمان مرزا و ابراہیم مرزا پسرانِ یوسف مرزا ہیں جن کے نام مرزا غالب کے خطوط ہیں۔

خاندانی حالات

مرزا صاحب کے ایک بڑے بھائی بھی تھے جنہوں نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں والدین کے سامنے انتقال کیا اُن کا نام محمد ذکی تھا۔ اُن کے بعد والدین کی تمام تر توجہ مرزا صاحب کی طرف مبذول ہو گئی اور بڑے لاڈ پیار سے پالے گئے

مرزا کی عمر سولہ برس کی تھی کہ ایک ہی سال میں قضائے الٰہی سے والدین

---

[1] طبا طبا اسماعیل ابن ابراہیم بن حسن بن علی علیہم السلام کا لقب ہے۔ ان کی زبان میں لکنت تھی، قاف کی جگہ طا بولتے تھے۔ ہمیشہ قبا کو طبا کہا اسی سبب سے یہ لقب ہوا۔ اُن کی اولاد کو ساداتِ طبا طبائی کہتے ہیں۔

کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ مرزا کی پرورش اُن کی خالہ اور رشتہ کے ماموں سے متعلق ہو گئی۔ لیکن یہ دونوں مربی طماع تھے خدا کے خوف سے نا آشنا اور جوہر انسانیت سے بے بہرہ۔ مرزا صاحب کے والدین نے جو متروکہ چھوڑا تھا، ان دونوں نے مرزا کی پرورش کی آڑ میں اس پر مخالفانہ قبضہ کر لیا۔

ننہال کی طرف سے مرزا صاحب کو چند گاؤں ملے تھے جن کی تحصیل وصول مرزا کے والد نے کبھی نہیں کی۔ بلکہ بطور ایک مشترک جائداد کے ماموں اور خالہ کے قبضہ میں رہنے دی جو پھر مرزا صاحب کو واپس نہ ملی۔

خالہ اور ماموں اس درجہ شقی القلب تھے کہ مرزا صاحب کی زندگی بھی انہیں بُری معلوم ہونے لگی کیونکہ اُن کی زندگی ان دونوں مُربیوں کے مفادات کے لئے مفید نہ تھی۔ اسی وجہ سے مرزا صاحب پر غیر معمولی سختی ہونے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب اپنے والد کے ایک دوست شیخ حسین بخش یا شیخ بخش کے پاس چلے گئے۔

شیخ صاحب مشہور خطاط اور اعلےٰ درجہ کے جعلیے تھے۔ بغیر کسی مشین کے صرف معمولی قلم دوات سے ہزاروں کے اسٹامپ بنا ڈالتے تھے، چنانچہ شیخ صاحب پر مقدمہ قائم ہوا اور ایسی لمبی سزا پائی کہ جیل ہی میں مر گئے۔

شیخ صاحب کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ مرزا صاحب کو اُن کی اُستانی کے ذریعے سے مل جاتا تھا، مگر شیخ صاحب کی تاکید تھی کہ مرزا اُن کی صحبت میں نہ آئیں مبادا جعل سازوں میں اُن کا بھی شمار ہو تو ایک دوست کی اولاد کو ضرر پہنچے۔ تقریباً چار پانچ سو روپیہ ماہوار مرزا صاحب خرچ کرتے تھے اور یہ بڑی

رقم شیخ صاحب ہی انہیں پابندی کے ساتھ دیتے تھے۔ ایک طرف ایک جعلئے کی یہ انسانیت اور احساسِ دوستی۔ اور دوسری طرف ماموں اور خالہ کے ناپاک منصوبے سچ ہے انسان بھی ایک معمہ ہے۔ ایسا معمہ جو احسنِ تقویم اور اسفل السافلین کے تضاد کو دور کر دیتا ہے۔

شیخ صاحب کے انتقال کے بعد مرزا کے وسائلِ آمدنی فروختِ جائداد پر موقوف رہے۔ اس زمانے میں مرزا کی وضع قطع لکھنؤ کے بانکوں کی سی تھی۔ سر پر ایک رنگین سیلا، جسم میں کسا ہوا انگرکھا، پاؤں میں چوڑی دار گھٹنا۔ ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا۔ یہ سب کچھ تھا مگر باایں ہمہ رنگینی فضول خرچی و عیاشی مرزا صاحب کا مشغلۂ کتب بینی کبھی ناغہ نہ ہوا اور اسی میں اُن کے کمال کا راز مخفی تھا۔

تعلیم

مرزا کے والد کو ریاضی اور نجوم سے بہت شوق تھا۔ مرزا صاحب نے فارسی کی تمام درسیاست اور ریاضی میں اقلیدس اور حساب اور احکام نجوم کے بعض رسائل اپنے والد سے پڑھے۔ اُس کے بعد مختلف مولویوں سے عربی پڑھی۔ سر کٹے نالے کے پاس مسجد میں ایک بزرگ رہتے تھے اُن کا اسمِ گرامی مولوی محمد یحییٰ تھا۔ مرحوم مسجد میں طلبا کو عربی درسیاست کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مجھے بھی اُن کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ مرزا صاحب نے اُن سے شرح جامی تک درسیات پڑھیں، اور اُس کے بعد مولوی غلام حسنین صاحب کنتوری سے پڑھا اور مولوی کمال الدین صاحب سے منطق کی درسیات پڑھیں، ان اساتذہ کے نام مرزا صاحب نے خود بتلائے ہیں۔

اس رسمی تعلیم کے بعد انہوں نے اپنی استعداد پر بھروسا کر کے کتب بینی شروع کی اور اُس کو اِس حد پر پہنچایا کہ آج جامعیت میں وہ ایک بے نظیر فرد تھے۔ مرزا کی زندگی کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہر شخص اپنا بہترین اُستاد آپ بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ صحیح ذوق اور حقیقی لگن اُس کے اندر موجود ہو۔

اسی دوران میں مرزا نے انگریزی بھی پڑھنا شروع کی، اور تعلیمی مصارف ان عمارتوں کی فروخت سے حاصل کیے جو خواجہ باسط کے ٹیلے پر تھیں۔ یہ کچی مکانات تھے جو دادھیال کی طرف سے ورثہ میں ملے تھے۔ رفتہ رفتہ انٹرنس پاس کر لیا۔ انٹرنس کے پرائیویٹ امتحان میں پاس ہوتے ہی مرزا صاحب رُڑکی کالج کی انجنیری کی تعلیم حاصل کرنے چلے گئے اور خداداد مناسبت سے جو اُنکو ریاضی کے ساتھ تھی اوورسیری کے امتحان میں پاس ہو گئے۔ پاس ہوتے ہی اوورسیری کا عہدہ کوئٹہ اور بلوچستان ریلوے میں مل گیا۔ اور بفراغت ریل کی پٹڑیاں بچھانے، عمارات کے نقشے تیار کرنے اور اسٹیشن بنوانے میں مصروف ہو گئے۔

بے چین طبیعتیں کبھی نچلی نہیں بیٹھتیں۔ اتفاق سے قدیم کیمسٹری کا ایک عربی رسالہ مصنفہ افلاطون ہاتھ لگا۔ اس کو پڑھنا تھا کہ تمام تر توجہ کیمسٹری کی طرف مبذول ہو گئی۔ نوکری اور ذاتی اشتغال سے مخالفت کا خیال کر کے مرزا نے فوراً استعفا دے دیا۔ کوٹھی کا تمام فرنیچر نیلام کر کے جدید کیمسٹری کے آلات ولایت سے منگوا لیے اور سیدھا لکھنؤ کا رُخ کیا۔

مرزا وسائل رزق کی تلاش میں دوسروں کی منت گزاری سے قطعاً بے نیاز تھے۔ فارسی میں پنجاب یونی ورسٹی سے منشی عالم کا درجہ بھی پاس کر چکے تھے۔ نخاس مشن

اسکول میں پرشین ٹیچری کی جگہ خالی تھی فوراً وہی قبول کرلی۔ مگر مصارفِ کیمیا سازی کے واسطے تنخواہ غیر مکتفی تھی اس لئے ایک لوہار کے لڑکے کے پڑھانے پر بایں شرط ٹیوشن کرلیا کہ بھٹی، دوکان بند ہوجانے پر مرزا صاحب کے تصرف میں رہے گی۔ لوہار نے بھی یہ شرط منظور کرلی۔

فلسفہ سے مرزا صاحب کو ایک فطری ذوق ہمیشہ سے تھا۔ سید شہنشاہ حسین صاحب بی۔ اے وکیل مرحوم سے ملاقات تھی۔ اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ مگر جب کبھی کسی فلسفی مسئلہ کے متعلق مرزا صاحب اپنی رائے ظاہر کرتے تھے تو فوراً سید صاحب ازروئے طعن کہتے۔

"بھائی صاحب! یہ فلسفے کے مسائل بغیر گرایجویٹ ہوئے سمجھ میں نہیں آسکتے۔"

غیور مرزا نے طے کرلیا کہ بغیر کسی مدرسہ کی بنچیں توڑے ہوئے وہ گریجویٹ ہوجائیں گے، چنانچہ یہی ہوا۔ غالباً ۱۸۸۵ء میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کا بی اے دلی جاکر پاس کرلیا۔

مرزا صاحب کو اس بات سے چڑھ تھی کہ کسی بات میں انہیں عدم علم کا اقرار کرنا پڑے۔ اس لئے کوئی اجنبی لفظ جو اُن کے کانوں میں پڑتا تھا۔ فوراً تحقیق پر آمادہ کردیتا تھا۔ عربی کی اصلیتِ دریافت کرنے کے لئے انہوں نے عبرانی زبان حاصل کی۔ فارسی کے لئے یونانی اور سنسکرت کا مطالعہ کیا۔ خداداد فہم و فکر کی بدولت وہ اتنی جلد ہر ایک چیز میں مہارت حاصل کرلیتے تھے کہ چند روز میں منتہی صاحب فن اُن سے مشورت لینے آیا کرتے تھے۔

اور نیشل یونی ورسٹی کلجبیا واشنگٹن امریکہ سے کسی مضمون کے صلہ میں پی ایچ ڈی کا ڈپلوما مل گیا۔ اس واقعہ کی اصل معلوم نہیں کہ کیونکر اور کس سلسلہ سے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مرزا کی ذات ایسے نمائشی اسناد سے مستغنی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کبھی ان باتوں کو اپنے لئے باعث شرف و افتخار نہیں سمجھا۔

مرزا صاحب یوں تو جامعیت میں بے نظیر تھے مگر اُن کا اصلی ذوق علوم حکیمہ تھے۔ عربی، عبرانی، یونانی، انگریزی، فارسی، ہندی، سنسکرت کی زبانوں پر اچھا خاصا عبور تھا۔ مشرقی اور مغربی دونوں علوم پر حاوی تھے۔ ایک مایۂ ناز ادیب شاعر منطق و فلسفہ، ریاضی ہیئت کے ماہر تھے۔ فلسفۂ قدیم و جدید کا نہایت تعمق سے مطالعہ کیا تھا اور اس پر کامل عبور حاصل کر کے اسلامی عقائد و روایات کو نہایت پُرزور دلائل سے صحیح فلسفہ کے مُطابق ثابت کرنے میں شغف انہماک رکھتے تھے۔ اور اس بارے میں اُن کا قدم تحقیق صراطِ مستقیم سے نہیں بھٹکتا تھا۔ اس موضوع پر اکثر و بیشتر مقالاتِ علمیہ اُن کے رسالہ الحکم اور اشراق میں شائع ہو چکے ہیں جو نہایت قابل قدر ہیں۔

وہ فلسفہ کے دقیق مسائل کو بلا تکلف اس طرح بامحاورہ، دلچسپ اور عام فہم اُردو میں تحریر کرتے تھے کہ معمولی استعداد کا آدمی بھی سمجھ لے۔ غالباً انہیں مقالات کی بنا پر دارالترجمہ، حیدر آباد دکن میں اُن کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ مرزا صاحب کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ فلسفہ و علوم حکمیہ کے پیش کرنے کا ایک مخصوص انداز اُردو زبان میں پیدا کیا۔

تاہل

مرزا کی پہلی شادی فیض آباد میں ہوئی، حالانکہ اُن کی مرضی تھی کہ خالہ زاد بہن سے شادی ہو، اپنی خالہ زاد بہن سے مرزا کا تعلق خاطر تھا۔ "افشائے راز عرف غریب خانہ" جو مرزا صاحب کا پہلا نقش ادبی ہے، اس میں دراصل خود انہیں کے واقعات ہیں۔ اس کتاب میں جن مگن کا تذکرہ کیا ہے یہ مرزا صاحب کی پہلی منگیتر تھیں۔ خاندانی نزاع کے باعث شادی نہیں ہوتی۔ موقع تو تھا کہ یہاں اُس کے بعض اقتباسات لکھتا، مگر یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ اِس وقت جو ضروری باتیں ہیں، وہی لکھوں گا۔

مرزا صاحب کی پہلی بی بی کچھ دنوں زندہ رہیں اور ایک خورد سال لڑکی چھوڑ کر انتقال کر گئیں۔ یہ صاحبزادی بھی پروان چڑھنے سے پہلے ہی داغ جدائی دے گئیں۔ مرزا صاحب پر اس کا بہت اثر ہوا۔ مگر انہوں نے تمام آلام کو علمی ذوق پر قربان کر دیا۔ شادی کے بعد بھی مرزا ایک منٹ کے لئے طلب علم سے غافل نہ رہے کچھ عرصہ کے بعد دوسری شادی کی، بی بیاں تو متعدد ہوئیں مگر اولاد انہیں بی بی (دوسری بیگم) سے ہوتی۔ چنانچہ دو لڑکے اور ایک لڑکی اب تک موجود ہیں۔

رسالہ اشراق

۱۸۸۶ء میں مرزا صاحب نے رسالہ اشراق جاری کیا اس رسالے میں مصنفات افلاطون کا مستقل ترجمہ ماہوار شائع ہوتا تھا۔ منطق اور اخلاق و حکمت کے متعدد رسالے اردو میں اسی رسالے کے ذریعے شائع ہوتے۔ اردو نثر کے ذریعہ سرسید احمد خاں اور انکے رفقائے گرامی

مختلف علمی وفنی مباحث وموضوعات ملک کے سامنے پیش کر چکے تھے، سرسید نثبلی، مولوی نذیر احمد وغیرہم کی خدمات اپنی جگہ مسلّم ہیں مگر منطق وفلسفہ اور اخلاق و حکمت پر ایسے محکم انداز میں مرزا صاحب سے پہلے کسی نے قلم نہ اٹھایا تھا۔ اس رسالۂ علمی کا حشر اچھا نہیں ہوا۔ پروپیگنڈے کے فن میں مرزا صاحب ہمیشہ سے کچے تھے۔ اس لئے یہ رسالہ مقبول تو ہوا مگر محدود گروہ میں، بالآخر ڈیڑھ سال چل کے رہ گیا۔ صاحبان ذوق نے یہ نمبر جلد بندھوا کر کتب خانوں میں رکھ لئے۔ چنانچہ کاکوری کی انجمن اخوان الصفا میں اس کے مسلسل نمبر اب تک محفوظ ہیں اور ان سے بیک نگاہ یہ پتہ لگتا ہے کہ اس وقت تک ایسا مفید رسالہ کوئی دوسرا رسالہ جاری نہیں ہوا۔

رسالہ الحکم

غالباً ۱۹۱۶ئہ میں رسالہ الحکم جاری کیا۔ گولاگنج میں سنٹرل اسکول کے سامنے اس کا دفتر تھا۔ یہی زمانہ ہے جب میں مرزا صاحب کی خدمت میں روزانہ جایا کرتا تھا اور ان کے کاموں میں اکثر شریک رہتا تھا۔ یہ رسالہ بھی چند سال چلا اس میں بھی بہترین مقالات علمیہ کا ذخیرہ شائع ہوتا تھا۔

اردو شارٹ ہینڈ

اردو شارٹ ہینڈ کی اصطلاحات مرزا صاحب ہی کی ایجاد ہیں جو کہ آج تک رائج ہیں۔

زیچ مرزائی

شاہزادہ مرزا ہمایوں قدر مرحوم تیموری ڈپٹی کلکٹر سے مرزا صاحب نے ایک مرتبہ زیچ محمد شاہی عاریت مانگی شہزادہ صاحب نے دینے سے انکار کیا مرزا صاحب نے پوچھا کیوں؟ تو جواب دیا کہ ایک سال میں آپ ایسی ہی تیار کردیں گے کہ زیچ محمد شاہی اس کے آگے بیکار ہو جائیگی"۔ اور میرا فخر خاندان خاک میں مل جائے گا"۔ بات ہنسی میں ٹل گئی مرزا غصہ پی گئے الغ بیگی اور بہادر خوانی زیچ مرزا کو مل گئیں کئی سنسکرت زیچیں بھی مرزا کے ہاتھ آگئیں سرکاری المانک اور رصد گاہوں کی رپورٹیں بھی بہم پہنچائی گئیں۔ بعض عمدہ دوربینیں بھی اس فقر و فاقہ کے عالم میں مول لیں آلات اسٹرانومی بھی خریدے اصطرلاب کے اوراق خود ہی پیتل کی چادروں پر بنا لیتے۔ ربع مجیب جس کا نصف قطر پانچ فٹ سے زیادہ تھا کچھ برطھئی کی مدد اور کچھ اپنی کاریگری سے دائرہ ہندسیہ کی مدد سے خط جنوب و شمال پر اس طرح سے نصب کر دیا گیا کہ ہر طرف گھوم سکے اور سیاروں کے ظل کی پیمائش میں آسانی ہو۔ کبھی رسدگاہ کالے پہاڑوں پر بنی اور کبھی مسکن خاص پر، الغرض دو سال کی جد وجہد میں زیچ مرزائی تیار ہو گئی جو ابھی تک محفوظ ہے۔

دو برس کے بعد شہزادے صاحب سے ملاقات ہوئی تو مرزا نے کسی قدر ترش رو ہو کر کہا "حضور زیچ تیار ہو گئی ہے، اب آپ اپنی خاندانی زیچ سے مقابلہ فرمائیں، دیکھیں کون افضل و مکمل ہے۔ حضور مجھے افسوس ہے کہ اس میں

جا بجا انگریز مصنفوں کا تذکرہ ہے۔ الغ بیگی اور بہادر خانی کا حوالہ ہے مگر آپ کے بزرگوں کے نام لینے کا فخر یہ کتاب نہ حاصل کر سکی"۔

ہدیۂ سُنیہ

مرزا صاحب کا ابتدائی زمانہ عیش پرستی میں گزرا۔ اُس زمانے کے رفیقوں میں نواب حسین مرزا پسر نواب ممتاز الدولہ بہادر ابھی تک موجود ہیں مگر باوجود رندی و سرشاری اُس وقت بھی مرزا کے عقائدِ مذہبی میں کبھی فرق نہ آیا۔ نہ فلسفۂ جدید نے اُن میں تذبذب پیدا کیا۔ نہ انگریزی نے کوئی تغیر۔ آزادی میں بھی گناہ کو گناہ سمجھتے رہے۔

مرزا ایک شریف اور ممتاز خاندان کے معزز فرد تھے، اُن کی اسلامی تعلیم ابتدا ہی میں مکمل ہو چکی تھی۔ عربی فارسی کی درسیات ختم کرنے کے بعد انہوں نے انگریزی کی طرف توجہ کی یا تو یہ اثر ہو۔ یا اُن کی فطری شرافت جو کچھ بھی سمجھئے مرزا صاحب مذہب کے ہمیشہ پکّے رہے، اسلامی عقائد کو فلسفہ سے ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے، چنانچہ رسالہ الحکم میں ان کے اکثر مضامین ایسے شائع ہوتے رہتے تھے۔

مرتے دم تک اُن میں مذہبی جوش رہا۔ اس کا ثبوت اُن کی معرکہ آرا تصنیف "ہدیۂ سُنیہ" ہے یہ کتاب شاہ عبدالعزیز مرحوم کی کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" کا جواب ہے جو تقریباً پچیس چھبیس جلدوں میں ہے ڈھائی سال کے عرصہ میں مرزا نے اس کو تیار کیا۔ جس زمانے میں رسالہ الحکم نکالتے تھے اس وقت کی تصنیف

ہے اس کتاب کے مجلدات مدرسۃ الواعظین میں محفوظ ہیں۔ میں نے اُن کی زبان سے بھی اس کے بعض مباحث سُنے ہیں۔

مناظرِ فطرت سے شوق

مرزا کی طبیعت ایسی ہمہ گیر تھی کہ ہر علم سے لگاؤ اور ہر فن سے مناسبت تھی اس کے ساتھ ساتھ طبیعت کی رنگینی اور شگفتہ مزاجی نے دلچسپی کا سامان بہم پہنچا دیا تھا۔ برسات کا زمانہ اکثر باغوں میں بسر ہوتا تھا۔ یاران ہم مشرب کا چھتا ساتھ ساتھ بیچ میں مرزا بلبل ہزار داستان بنے بیٹھے رہتے تھے۔ تمام جاباد میں جو تلف ہوگئی مرزا صاحب کو کتیا بیگم کے باغ سے نہایت محبت تھی یہ باغ مرزا صاحب کا آبائی باغ ہے اور ان کے بعض عزیزوں کے قبضہ میں ہے۔

کتیا بیگم کی شہرت اس نامعقول نام سے یوں ہوئی کہ وہ باغ کی حفاظت اپنے مکان کی چھت پر بیٹھ کر خود کرتی تھیں۔ کوئی اجنبی آدمی یہاں داخل ہوا اور انہوں نے ڈانٹ بتائی۔ اس ڈانٹ ڈپٹ نے انہیں کتیا بیگم کا لقب دلوا دیا مرزا کو مطالعۂ مناظرِ فطرت کا بے پناہ شوق تھا برسات کے قبل شہر کے باہر وہ ایک نہ ایک باغ اجارہ پر لے لیتے تھے اور گرمیوں کی تعطیل سے برسات تک وہیں قیام کرتے تھے۔ کبھی باغ لئے تو ٹھیکے پر لیکن ہزاروں روپے درختوں کی تیاری، روش پڑی کی درستی، کھپریلوں اور کوٹھریوں کی مرمت میں، اپنی جیب سے صرف کر ڈالے اور صرف ایک موسم بسر کر کے باغ اُن کے مالکوں کے حوالے کر دیئے اُن کا قول تھا کہ ہر انسان کو بنی نوع انسان کے لئے مفید بننا چاہیئے۔ میں نے انہیں آراستہ

کیا دوسرے فائدہ اُٹھائیں۔

ملازمت

مرزا کو زیادہ ہوس نہ تھی، تعلیمی پیشہ کسی قدر آزاد ہوتا ہے اس لئے اسی صیغہ میں رہنا پسند کیا۔ کوئٹہ اور بلوچستان میں اورسیری کے عہدہ پر رہے۔ اس کے بعد نخاس مشن اور کرسچین ہائی اسکول میں رہے۔ پھر بغیر کسی خواہش کے عیسائی مشن نے ریڈ کراس کرسچین کالج میں پروفیسری کے عہدے پر متقرر کردیا اور اسکول سے اُن کے خدمات قطع کر دیئے۔ علمی قدر دانی کی ایسی اعلےٰ مثالیں ہماری قومی درسگاہوں کی تاریخ میں شاید ہی ملیں۔ ہم لوگ تو علمی مراکز میں بھی دفتری سازشوں میں اپنے ہوش وخرد کے سفینہ کو آگ لگا دیتے ہیں۔ انگریزوں کی درسگاہوں میں جوہر ذاتی اور معیار علم کی قدر کی جاتی ہے اور رسمی کارروائی کے سہارے عزتِ نفس کو مجروح نہیں کیا جاتا۔

اس کالج میں تئیس سال مرزا نے پڑھایا کہنے کو تو عربی وفارسی کے پروفیسر تھے لیکن وہاں انہوں نے بطور معلم فلسفہ وتاریخ وہیئت وکیمیا کا مدتوں کام کیا۔ اس جامعیت کے سبب سے باوجود کالج سے اکثر غیر حاضر رہنے کے پرنسپل نے کبھی اُن سے باز پرس نہیں کی۔ جب جی چاہا نہ گئے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ اپنے دوستوں میں سے کسی کو بھیج دیا۔

"بھائی جاؤ ایک گھنٹہ پڑھا دینا۔ میں تو آج چھب ناتھ کی چوکی پر کنیا بیگم کے باغ میں رہوں گا۔"

اخلاق و اوصاف

مرزا صاحب نہایت سادہ مزاج، زندہ دل، احباب پرست، آزاد منش، مستغنی و بے پرواہ تھے۔ جو ظاہر تھا وہی باطن، زمانہ سازی کی باتوں سے نفرت ظاہری تکلفات سے طبیعت ناآشنا۔ جس سے دل صاف نہیں ہوتا تھا اس سے ملنا بھی کبھی پسند نہیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی صاف منہ پر کہہ دیا کرتے تھے۔ سچے دوستوں سے نہایت خلوص اور محبت سے پیش آتے تھے اور کوئی چیز اُن سے عزیز نہ رکھتے۔ مثنوی اُمید و بیم میں ان باتوں کا خود بھی اظہار کیا ہے ؎

مجھ کو نفرت ہے ریا کاری سے ۔۔۔ چڑھ ہے عیاری و مکاری سے
دل سے ہوں خادمِ اربابِ وفا ۔۔۔ میری طینت میں نہیں مکر و دغا
سوظن کی مجھے پروا ہی نہیں ۔۔۔ بدگماں سے کبھی ملتا ہی نہیں
مجھ کو رغبت نہیں ان باتوں سے ۔۔۔ عار ہے ایسی ملاقاتوں سے
جن کی طینت میں نہ ہو شر و فساد ۔۔۔ وہ سمجھتے ہیں مجھے نیک نہاد
زیرِ بے عیش ہے طبیعت میری ۔۔۔ لوث سے پاک ہے طینت میری
میرا مسلک نہیں جز سادہ دلی ۔۔۔ مجھ کو مطبوع ہے آزادہ دلی
فخر ہے خوبیٔ فطرت پہ مجھے ۔۔۔ ناز ہے حسنِ طبیعت پہ مجھے

یہ شاعری نہیں بلکہ اُن کے اصلی جذبات اور سچے خیالات ہیں جن پر زندگی بھی عامل رہے۔

روپیہ جس زمانے میں اُن کے پاس ہوتا تھا کسی کے سوال کو رد نہ کرتے

تھے یاران دیرینہ ہر وقت گھیرے رہتے تھے۔ جس نے جو مانگا دے دیا۔ بھولے اس قدر تھے کہ اکثر لوگوں کے فریب میں آجایا کرتے تھے، نازک مزاج بھی اتنے تھے کہ ذرا ذرا کی بات میں بگڑ جایا کرتے تھے مگر آئینہ قلب کی جلا کا یہ عالم تھا کہ جلد ہی معاف کر دیتے تھے اور اس تکدر کا کوئی اثر باقی نہ رہتا تھا۔ مولانا شبلی مرحوم کو مرزا سے خاص اُنسیت تھی مرزا کے اکثر اشعار اُن کو یاد تھے جو احباب کے مجمع میں سُنایا کرتے تھے۔ ندوۃ العلماء میں فلسفہ کا لکچرار مقرر کرنے کی تجویز انہوں نے کی تھی اس موقع پر یا کسی اُجرتی کام کے متعلق مرزا نے ایک ماہ کا معاوضہ پیشگی طلب کیا۔ مولینا نے یہ مصرعہ مزاحاً لکھ بھیجا۔

قرار در کف آزادگاں نہ گیرد مال

مرزا صاحب بگڑ گئے اور سخت جواب لکھا، میں گیا تو مجھ سے سب واقعہ بیان کیا اُس کے بعد مولینا شبلی نے ندوہ کی لکچراری پر اصرار کیا۔ مرزا نے کہا مجھے استخارہ میں منع آتا ہے۔ مولینا شبلی نے کہا "ایک فلسفی اور استخارہ کا قائل ہو تعجب ہے"۔ مرزا نے کہا "ایک مسلمان کی طرف سوا ظن کرنے سے استخارہ کہیں بہتر ہے"۔ شبلی نکتہ سنج و نکتہ شناس تھے، مرزا کے مدعا کو پاگئے اور خاموش ہو رہے۔ مرزا صاحب وسائل رزق کی تلاش میں کسی کی منت گزاری سے قطعاً بے نیاز رہتے تھے۔ ہمیشہ اپنی محنت سے اپنے مصارف پورے کئے۔

قومی معاملات میں بڑی فراخ دلی سے چندہ دیتے تھے۔ میں نے شیعہ کانفرنس کے ایک اجلاس میں دیکھا نوٹوں کی گڈیاں اُن کی جیب میں ہیں اور چندوں کے مواقع پر سبقت کر رہے ہیں۔

مرزا صاحب غلطی کا ہمیشہ اعتراف کر لیا کرتے تھے۔ کبھی تاویلیں کرنا یا سخن پر اصرار کرنا اُن کا شیوہ نہ تھا، لیکن اُس کے بار بار ذکر کرنے سے چڑھتے تھے مرزا کی آنکھ میں مروت تھی۔ جب کوئی کسی بات پر اصرار کرتا تو ان سے انکار نہ بن پڑتا تھا!

مرزا صاحب اپنی دھن کے پکے تھے جس زمانے میں جس چیز کی طرف مائل ہو گئے پھر دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے رات دن اسی میں مشغول رہتے تھے۔ یہ کیفیت مزاج کے عدم توازن تک جا پہنچی تھی۔

مرزا ایک طرف حکیم و فلسفی، ایک طرف شاعر، ایک طرف ادیب و منطقی دوسری طرف بھوت پریت کے قائل ایک طرف علماء و فضلاء کی صف میں دوسری طرف بڑی بوڑھیوں میں بیٹھ کر قصہ کہانیاں سُنا کرتے تھے روپیہ اِدھر آیا اُدھر خرچ ہو گیا بے پروائی و استغناء کا یہ عالم کہ نہ مال کی پرواہ نہ اسباب کا خیال۔ ایک مرتبہ تمام اسناد اور ڈپلوما چوری ہو گئے مگر مرزا نے بھی پروا نہ کی۔ کہنے لگے میرا علم تو میری ذات میں ہے کاغذ کے ان پُرزوں کو کسی کی علمیت سے کیا علاقہ۔ شکر ہے کہ میکدہ بے نیاز نے مجھے کاغذی اسناد سے بے نیاز کر دیا۔ بات یہ ہے کہ مرزا کی طبیعت نمود و نمائش سے ہمیشہ متنفر رہی اور اُن کا مذاق علمی ہمیشہ قرونِ اولیٰ کے علماء و حکماء کا سا تھا۔

مرزا کو دُنیا اور اسباب دُنیا سے بہت کم تعلق رہا۔ خانہ داری کے امور میں اُن کو کوئی سلیقہ نہ تھا۔ نہ زینت و آرائش سے کوئی تعلق اُن کے بیٹھنے کا کمرہ دیکھئے ایک چٹائی بچھی ہوتی ہے کونوں میں کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے اور وہ بھی

بے ترتیب کاغذات بکھرے ہوتے ہیں۔ کہیں لحاف پڑا ہے کہیں توشک کہیں انگیٹھی رکھی ہوئی ہے اور دیوار سے تکیہ کئے ہوئے مرزا بیٹھے ہیں ایک ڈرِ خما حقہ سامنے ہے اور برابر لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ زیادہ تکلف کیا تو نیچے ایک کمبل بچھا لیا۔

مرزا ہمیشہ کے رنگین مزاج تھے۔ بڑھاپے نے چہرے پر جھریاں ڈال دی تھیں بال سفید ہو گئے تھے کمر میں خم آ گیا تھا مگر دل اُسی طرح جوان تھا۔ لکھنؤ میں ایک مرتبہ مولوی عبدالماجد صاحب بی اے نے دعوت کی میں بھی مدعو تھا خیال آیا کہ مکان راستہ میں ہے مرزا کو بھی لیتا چلوں مکان پر گیا تو مرزا صاحب اس شان سے نکلے کہ سفید شیروانی پہنے ہوئے اور گلے میں پھولوں کا ایک موٹا سا گجرا پڑا ہوا جو سفید داڑھی کے قریب خاص بہار دکھا رہا تھا۔ مجھ کو ہنسی آ گئی مگر ضبط کیا۔ مرزا تاڑ گئے "کہنے لگے کہ موسم کی بہار یہی ہے" اسی طرح دعوت میں گئے دیر تک شعر و شاعری رہی۔ سچ یہ ہے کہ مرزا کے بھولے پن اور سادگی کی کوئی حد ہی نہ تھی فلسفہ میں جب منہمک ہوتے تو کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ اہل دُنیا کے خیالات مختلف ہوتے ہیں کچھ لوگ معترض رہتے تھے۔ کچھ خلل دماغ بتاتے تھے۔ "مثنوی امید و بیم" میں انہیں باتوں کی طرف اشارہ ہے۔

ظاہر شرع پر واجب ہے عمل	تاکہ باطن میں نہ کچھ آئے خلل
نہ کہ باطن تو ہو بالکل ابتر	اور ظاہر یہ عمل ہو بے خبر
یہ سمجھتے ہی نہیں مغز سخن	سربسر جہل سراسر کودن
ان کی معقول ہے وہ نامعقول	جس نے برباد کئے فقہ و اصول
جب ہو کچھ بحث تو لائیں وہ دلیل	غیر قوموں میں ہوں ہم جس سے ذلیل

جانتے ہی نہیں یہ علمِ کلام
عقلا کو ہے خطاب اُن سے حرام

نہ محقق نہ مناظر ہیں یہ
محض مغرور و مکابر ہیں یہ

کیا بتائیں گے ہمیں راہِ نجات
ہیں یہ خود گمرہ کرنے ظلمات

بسکہ ہے جہل سے تاریک خیال
یہ سمجھتے نہیں باریک خیال

نہ قیاس اُن کا نہ عقل ان کی ٹھیک
فلسفہ کفر ہے اُن کے نزدیک

اہلِ تقلید سے رغبت ہے انہیں
اہلِ تحقیق سے نفرت ہے انہیں

فلسفہ سے نہ ہو کیوں اِن کو عناد
دشمنِ عقل ہیں یہ اہلِ فساد

ان کی تفصیل ہے بالکل مجمل
اُن کی تاویلیں سراسر مہمل

اُن کی صحبت میں ہو ضائع اوقات
سوءِ ظن سے نہیں خالی کوئی بات

اہلِ حکمت کو برا کہتے ہیں
کچھ سمجھتے نہیں کیا کہتے ہیں.

اُن کو ہرگز نہ سلجھتے دیکھا
اصطلاحوں میں اُلجھتے دیکھا

چند الفاظ جو ہیں وردِ زباں
اُن کو سمجھیں یہ علمِ دو جہاں

جو مسائل کہ ہیں بالکل مردود
علم سے اُن کے وہی ہیں مقصود

چند باتوں پہ ہے حکمت کا مدار
اور سب زعم میں اُن کے بیکار

اُن کی حکمت ہے فقط خود رائی
نہ قیاسی ہیں یہ استقرائی

متن ہی میں ہے جو بین الدفتین
اُن کے نزدیک ہے وہ عین العین

رائے انساں کی بدلتی ہی نہیں
بحث اس بات میں چلتی ہی نہیں

تجربے سے نہیں اُن کو سروکار
نظریات سے بالکل انکار

اِن کو آثارِ جہاں سے کیا کام
اِن کو اسرارِ نہاں سے کیا کام

نہ زمانے کے جزو کل سے غرض — نہ ترقی نہ تنزل سے غرض
اگلے وقتوں سے محبت ہے انہیں — اہل یونان سے ارادت ہے انہیں
سن لیے ہیں جو کچھ اُن کے اقوال — پس وہ کافی ہیں پئے استدلال
جو ارسطو نے کہا تھا سچ ہے — جو کتابوں میں لکھا تھا سچ ہے
فکرِ دُنیا سے ہیں ازبس مالوف — اُن کی ہمت ہے اسی پر موقوف

اسی کے بعد ابنائے زمانہ کے حالات کا نقشہ کھینچا ہے۔

اک جہاں محو ہے خود رائی میں — لطف کیا قافیہ پیمائی میں
کون سنتا ہے ترانے تیرے — وحشت افزا ہیں ترانے تیرے
دل عزیزوں کا دکھا جاتا ہے — رنگ چہروں سے اُڑا جاتا ہے
ان دنوں ہے یہ نصیحت بیکار — لوگ ہیں جام ہوس سے سرشار
علم و حکمت کی انہیں فکر نہیں — ایسی باتوں کا کہیں ذکر نہیں
اِک زمانے کو ہے دولت کی تلاش — علم ہے آلۂ تحصیل معاش
منفعت کا زمانے میں ہے دور — مادیت نے نکالے ہیں یہ طور
ہے جہاں حرص و ہوس مائل — شاذ و نادر ہیں خدا مائل
وہ جو بنتے ہیں بظاہر دیندار — اُن کو ہے حد سے زیادہ انکار
کوئی دل اُن کے ٹٹولے تو سہی — راز سربستہ کو کھولے تو سہی
کیا کہوں منہ سے کیا سمجھے ہیں — زر کو کم بخت خدا سمجھے ہیں
خود غرض کو یہ سمجھتے ہیں فہیم — خود غلط کو یہ سمجھتے ہیں حکیم
ان کی حکمت نہیں جز کذب و دروغ — ہے جہالت کو زمانے میں فروغ

پختہ کاری کو زبوں کہتے ہیں
ہوشیاری کو جنوں کہتے ہیں
حرص نے اُن کو کیا ہے گمراہ
رحم و ایثار کو سمجھے ہیں گناہ
معصیت نام ہے ناداری کا
مصلحت اسم ہے عیاری کا
اِن کا انصاف ستمگاری ہے
ان کا اخلاق ریاکاری ہے

آیندہ باب میں مرزا کی شاعری اور اس مثنوی کا ذکر کروں گا۔

حیدرآباد کا سفر

مرزا کو لکھنؤ سے خاص محبت ہے۔ آخر زمانے میں دارالترجمہ عثمانیہ میں اُن کا تقرر ہوا خدا جانے کن مجبوریوں سے منظور کر لیا مگر چلتے وقت ایک غزل میں یہ شعر کہتے گئے ؎

دلّی چھٹی تھی پہلے اب لکھنؤ بھی چھوڑیں
دونوں تھے شہر اپنے دونوں تباہ نکلے

شعر بتاتا ہے کہ لکھنؤ چھوڑنے کا اُن کے دل پر خاص اثر تھا۔ حیدرآباد کے حالات کا مجھ کو علم نہیں مگر یہ جانتا ہوں کہ وہ اپنے وطن کے اس قدر دلدادہ تھے کہ بایں پیرانہ سالی و کمزوری دوسرے تیسرے مہینے ضرور آیا کرتے تھے۔ نئی سڑک جو امین آباد کو گئی ہے وہیں کوئی کمرہ کرایہ پر لے لیتے تھے۔

جب حیدرآباد سے آتے مجھ کو ضرور بلواتے تھے۔ ایک دن گیا تو دیکھا کہ مرزا چارپائی پر بیٹھے ہیں اور ہارمونیم سامنے رکھا ہے۔ مجھ کو دیکھتے ہی کہا آہا آئیے، اکبر کے جلوس کے وقت جو گیت گایا تھا وہ سنئے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ

آج کل علم موسیقی کا شوق ہے اور کوئی کتاب بھی اس موضوع پر لکھ رہے ہیں۔ بعض وقت مرزا صاحب کی باتوں پر ہنسی آجاتی تھی مگر ان کو کسی بات کی پروا نہ تھی وہ اپنے خیالات میں مست رہتے تھے اور اپنے دل کو خوش رکھتے تھے۔

مدرستہ الواعظین

مرزا صاحب کے مزاج میں ایثار اور طبیعت میں فیاضی تھی جس کی نمایاں مثال یہ ہے کہ جب حیدر آباد جانے لگے تو اپنا عظیم الشان کتب خانہ جو تمام عمر کا سرمایہ تھا مدرستہ الواعظین کو دے دیا علمائے فرقۂ امامیہ میں (شمس العلماً) مولانا سید نجم الحسن صاحب سے بہت ملاقات تھی مولانا اکثر خود تشریف لے جایا کرتے تھے، خدا جانے اُن کی تحریک سے یا خود مرزا صاحب نے کتب خانہ جس میں ہزاروں کی تعداد میں ایک کافی سرمایہ تھا مولینا کی خدمت میں بھجوا دیا جو آج تک محفوظ ہے۔

آخر حیدر آباد کی خاک دامنگیر ہوئی اور ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء روز چہار شنبہ کو مرزا صاحب نے دُنیا کو خیر باد کہا۔ اُن کا چراغ زندگی نہیں بُجھا بلکہ محفل کمالات کی ایک روشن شمع ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی جس کی نظیر دُنیا پیدا نہیں کر سکتی انتقال کے وقت ۷۴ سال کی عمر تھی۔ مرزا صاحب ترپ بازار راجہ مرلیدھر کے باغ میں مقیم تھے اور اسی باغ کے عقب میں ہمیشہ کے لئے آرام کیا۔

تصنیفات

۱۔ فطرۃ الاسلام مطبوعہ ۲۔ ہدیہ سنیہ در علم کلام (۲۹ جلد غیر مطبوعہ) ۳۔ جوزف

آف لاجک (ترجمہ) ۴۔ افلاطون کی حکومت جمہوریہ۔ ۵۔ کتاب الاخلاق ارسطو
۶۔ زیچ مرزائی در ہیئت ۷۔ ابطال الزمان ۸۔ رسالہ در توحید و اثبات واجب الوجود
۹۔ رسالہ در منطق استقرائی (غیر مطبوعہ) ۱۰۔ رسالہ در اصول مناظرہ (غیر مطبوعہ) ۱۱۔
رسالہ در علم النفس (غیر مطبوعہ) ۱۲۔ مصطلحات کیمیا (غیر مطبوعہ) ۱۳۔ رسالہ در استعمال
اصطرلاب (غیر مطبوعہ) ۱۴۔ طلسمات ۱۵۔ امراؤ جان ادا ۔ ۱۶۔ ذات شریف
۱۷۔ شریف زادہ ۱۸۔ مرقع لیلیٰ مجنوں ڈرامہ منظوم ۱۹۔ افشائے راز ۲۰۔ بہرام کی
رہائی ۔ ۲۱۔ خونی بھید ۲۲۔ خونی جورو ۲۳۔ مثنوی لذت فنا ۲۴۔ مثنوی بہار ہند
۲۵۔ مثنوی امید و بیم ۲۶۔ کلیات اردو (قصائد مثنویات غزلیات کا ایک کافی
ذخیرہ تھا جس کا پتہ نہیں)

مرزا صاحب کی شاعری

مرزا صاحب کو شاعری کا شوق بچپنے سے تھا مثنوی امید و بیم میں کہتے ہیں ؎

چار دن سے نہیں یہ شوقِ سخن — بچپنے سے ہے مجھے ذوقِ سخن
قدر دانوں میں ہے عزت میری — نکتہ سنجوں میں ہے شہرت میری
مجھ کو پہچانتے ہیں اہلِ ہنر — جوہری جانتے ہیں قدرِ گہر
لوگ آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں مجھے — آرزوؤں سے بلاتے ہیں مجھے
رونقِ بزمِ سخن ہے مجھ سے — زینتِ صحنِ چمن ہے مجھ سے

ابتدائے عمر میں ایک بزرگ مرزا دبیر کی خدمت میں لے گئے انہوں نے بلحاظ مناسبت عمر مرزا محمد اوج سے تعارف کرا دیا صرف تین غزلیں دکھائیں، اس کے بعد مشورہ رہا۔ مرزا کی زبان موجودہ شعراء میں لکھنؤ کی ٹکسالی زبان تھی جس قدر محاورات پر ان کو عبور تھا ایسی کوئی ہستی آج شعراء میں نظر نہیں آتی اس کا سبب ان کی فطری صلاحیت کے علاوہ ان کی ہمہ دانی اور مختلف صحبتیں تھیں، ایک طرف اہلِ علم کے ساتھ علمی معاشرت دوسری طرف لکھنؤ کے مختلف طبقات سے تعلقات، مرزا اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے تھے قصائد بھی کہے مثنویاں بھی کہیں، غزل بھی کہی، نظم و نثر پر ایک طرح قادر تھے، مگر نظم سے زیادہ نثر لکھی اور

ایسی لکھی کہ آج اُن کی کتابیں زبان اُردو کا بہترین سرمایہ ہیں۔

مرزا کا کلام اگر جمع کیا جاتا تو ایک ضخیم کلیات ہوتا مگر ان کی بے پروائی بے اعتنائی کا یہ عالم تھا کہ غزل کہی اور پھینک دی یا کسی نے مانگی تو وہی مسودہ اس کو دے دیا۔ کلام جو کسی نے لے کر چھاپ دیا وہ تو چھپ گیا ورنہ خود انہوں نے کبھی نہ چھپوایا نہ جمع کیا خدا بخشے علی محسن خان کو جن کا تخلص ابر تھا کہ جن کی سعی و کوشش سے آج مرزا کی چند غزلیں بھی دستیاب ہو سکیں۔ ابر مرحوم جس زمانے میں معیار نکالتے تھے تو مرزا کی خدمت میں برابر جایا کرتے تھے اور معیار کی ہر طرح میں اُن سے کسی نہ کسی طرح غزل کہلوا لیا کرتے تھے۔ چنانچہ اِس مضمون میں اکثر غزلیں معیار کے مختلف نمبروں سے لی گئی ہیں۔ غزلیات کے علاوہ "مراسلہ مرزا" کے عنوان سے ایک مستقل مضمون فلسفۂ شعر کے متعلق معیار میں شائع ہوا کرتا تھا۔ مرزا صاحب کی بے پروائی کا عالم دیکھ کر مرزا اوج صاحب مرحوم نے آپ کا کلام جمع کرنا شروع کیا۔ مسودات مرزا صاحب سے لیتے تھے اور اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے مگر افسوس بقول اُن کے صاحبزادے مرزا محمد طاہر صاحب رفیع کے وہ سب ذخیرہ ضائع ہو گیا۔

شاعری مرزا صاحب کا خاص مشغلہ نہ تھا بلکہ تفنن طبع اور مشاغل تفریح میں داخل تھا اور حقیقت تو یہ ہے کہ

شعر خود خواہش آں کرد کہ گرد د فن ما

میرے نزدیک لکھنؤ میں اُن کی ذات ایک مجدد فن کی تھی ان کی شاعری کا آغاز اُس وقت ہوا جب لکھنؤ میں آتش و ناسخ کے ترانے گونج رہے تھے اور

محفلوں پر وہی رنگ چھایا ہوا تھا اس وقت سب سے پہلے جس شخص نے ترمیم کی وہ مرزا کی ذات تھی۔ اور یہ سہرا انہیں کے سر رہا۔ اُن کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگوں نے بھی اس رنگ کو اختیار کیا۔ مگر غالب کے رنگ میں جس قدر کامیابی مرزا کو حاصل ہوئی کسی ایک کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ مرزا نے زبان میں تقلید نہیں کی بلکہ خیالات و طرزِ ادا میں غالب کا تتبع کیا دوسروں نے فقط زبان اور فارسی ترکیبوں میں تقلید کی۔ مرزا نے ابتدا میں مدتوں کلام غالب سامنے رکھ کر فکر سخن کی۔ جس طرح کوئی خوش نویس اُستاد کی وصلی سامنے رکھ کر نقل کرتا ہے

مرزا صاحب زبان کی خرابیاں دیکھ کر بہت متاثر ہوتے تھے۔ ایک زمانے میں "الواعظ" مدرسۃ الواعظین کا رسالہ میری ادارت میں نکلتا تھا اُس کو برابر دیکھا کرتے تھے۔ کسی صاحب کے مضمون میں لوٹ کر بمعنی پلٹ کر لکھا ہوا تھا۔ اُن کے دماغ میں محفوظ رہا لکھنؤ آئے تو مجھ سے ملتے ہی شکایت کی:

"کیوں صاحب جو رسالہ آپ کی ادارت میں نکلتا ہو اس میں لوٹ کر لکھا جائے" شعر میں بھی سب سے پہلے زبان کو دیکھتے تھے اوس کے بعد خیالات اُن کے شعر میں کبھی اغلاق لفظی و معنوی ہوا ہی نہیں۔ مضامین بہت بلند ہوتے تھے لیکن نہایت صاف اور شستہ زبان میں ادا کرتے تھے۔ آخر عمر میں بے حد صاف کہنے لگے تھے۔ ایک دن زمانۂ حال کی غزل سُنانے لگے، میں نے کہا مرزا صاحب کہاں وہ کلام کہاں یہ کہنے لگے۔

"بھائی یاروں نے اب بہت بلند پروازیاں شروع کر دی ہیں شعر کے معنی بھی مشکل سے سمجھ میں آتے ہیں۔ مذاق بگڑ چلا میرا مسلک عام روش

سے جُدا ہے اب مجھے یہی رنگ پسند ہے"۔

اکثر متروکات کے سختی سے پابند تھے ایک دن میں نے ایک غزل سنائی جس کا مطلع تھا :-

کوئی مریضِ غم وا پسیں نہیں
اک جان ہے سَو وہ بھی کہیں ہے کہیں نہیں

کہنے لگے "سو" کیوں کہا، دیر تک اس لفظ پر گفتگو ہوتی رہی مگر ایک نہ سُنی۔

مرزا ندرتِ تخیل اور بلندیٔ پرواز سے بہت خوش ہوتے تھے مگر جہاں مسلم اصول اساتذہ کے خلاف یا زبان و بیان میں کوئی تغیر دیکھتے تھے فوراً غصہ آجاتا تھا۔ اِن کو شاعری میں موجودہ دور کی بے راہ روی سے سخت نفرت تھی آج کل انگریزی کے تتبع میں بعض لوگ جو ترکیبیں تراشتہ کرتے ہیں اُن کو بے حد ناپسند تھیں، زمانہ کے جو تغیر پابندیٔ اصولِ فن کے ساتھ ہوتے ہیں ان کے معترف تھے مگر ایجاد بندہ سے سخت متنفر تھے اس مقام پر اُن کی تحریر کا مختصر حصہ نقل کرتا ہوں جو میرے دیوان پر لکھی تھی، اس سے مقصود خود ستائی نہیں بلکہ اُن کے خیالات کا اظہار ہے۔

" زمانہ جو رنگ بدل رہا ہے اور ہمیشہ بدلتا رہے گا۔ اس سے شاعری مستثنیٰ نہیں رہ سکتی۔ جناب عزیز نے شاعری کی اُس حالت کو واضح کر دیا جو زمانے کا اقتضا تھا جس طرح صاف آئینہ پر ہر چیز کا عکس خوب دکھائی دیتا ہے اسی طرح طبع سلیم ترقی کو من وعن ظاہر کر دیتی ہے، آپ نے رنگ بدلنے کا خود

قصد نہیں کیا اور خوب کیا، جن لوگوں نے یہ وطیرہ اختیار کیا اور اپنے نزدیک جدت پسندی کو دور تک کشاں کشاں لے گئے انہوں نے شاعری کو ایجاد بندہ بنا کے ایسی شے پیدا کر دی جس کو نہ مشرقی کہہ سکتے ہیں نہ مغربی۔"

ہرزہ مشتاب در رہ جادہ شناساں بردار
ایکہ در راہ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

جادہ شناسوں کے راستہ پر چلنا ہی اس عہد میں دشوار ہو گیا ہے ان باتوں سے مرزا کو تعجب تھا اور متاثر ہوتے تھے، مرزا صاحب کے کلام کے خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ کوثر سے دھوئی ہوئی زبان شستہ صاف اور سلیس
۲۔ انداز میں بانکپن،
۳۔ فصحا کے محاورے
۴۔ خیالات بلند اور فلسفیانہ مگر اسی حد تک جہاں تک غزل متحمل ہو سکے،
۵۔ عاشقانہ رنگ غالب مگر ہر تخیل ابتذال سے پاک و صاف،

زبان کے اس قدر دلدادہ تھے کہ جس شعر میں کوئی محاورہ کی خوبی ہوتی تھی اس کو پڑھتے وقت خود بھی محظوظ ہوتے تھے، پڑھنے کا انداز بالکل سادہ تھا نہ لحن نہ ترنم جس طرح باتیں کرتے ہیں، مگر اکثر زبان کے ٹکڑوں کو خاص طور پر ادا کرتے تھے۔

مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے تھے مگر جب کبھی اصرار ہوتا تھا تو ضرور جاتے تھے، غزل گوئی میں اپنا زیادہ وقت صرف نہیں کرتے تھے، مشاعرہ کے دو

ایک گھنٹہ پیشتر غزل کہنا شروع کرتے تھے وقت تک کافی تعداد اشعار کی ہو جاتی تھی۔

ایک زمانے میں بالالتزام میر کے مکان پر ماہوار مشاعرہ ہوا کرتا تھا مرزا اکثر اُن صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں، چنانچہ ایک مشاعرہ میر تقی میر کی فاتحہ صد سالہ کے نام سے ہوا تھا جس میں مرزا صاحب نے میر کی شاعری پر ایک پرمغز تقریر کی تھی اور ذیل کی غزل طرح میں پڑھی تھی جس کے اکثر شعر لکھنؤ میں زبان زد ہو گئے ہیں، اس طرح میں میر و غالب کی معرکہ آرا غزلیں ہیں۔

(۱)

حسن شاہد ہے میری رنگینیٔ تحریر کا
اک ادائے شوخ ہے جو رنگ ہے تصویر کا

قطرت انسان کی کمزوری دکھاتے ہیں۔

ضعف میں شکوہ عبث ہے گردش تقدیر کا
بن پڑا وہ ہم سے کب جو کام تھا تدبیر کا

شعر کا انداز دیکھئے

دیکھ میرا حال اگر تو جھوٹ سمجھے عشق کو
سُن مری فریاد اگر قائل نہ ہو تاثیر کا

شعر نہیں ایک عبرت کا دفتر ہے۔

یاد کر لینا کہ اکثر بستیاں ویران ہوئیں
اس خرابے میں خیال آئے اگر تعمیر کا

شعر کی گہرائی دیکھئے۔

تھم گئے آنسو نمائش جب ہوئی مد نظر
رُک گیا نالہ جو اندیشہ کیا تاثیر کا

زبان اور انداز بیان دیکھئے اس رنگ کے شعر مرزا کی خاص پسند کے تھے مشاعروں میں انہوں نے ایک خاص انداز سے اس کو پڑھا ہے۔

الحذر یہ کام دنیا میں تمہیں سے ہو سکا — چاہنے والے پہ اپنے کھینچنا شمشیر کا

عاشقانہ شعر ہے مگر وہی ندرت بیان اور خوبیٔ زبان کا پہلو لئے ہوئے

طبع نازک پر گراں کیوں ہے سراسر پھوڑنا — ہم نہ کہتے تھے نہ چھیڑو تذکرہ تقدیر کا

یہ شعر بیت الغزل ہے اس کا زور دیکھئے۔

وضع کے پابند ہم دیوانگی جدت پسند — پھر گلا یا جاتے لوہا قیس کی زنجیر کا

غرض مشاعرہ ملحوظ رکھتے ہوئے مقطع کہا ہے۔

اس غزل گوئی وہ تاثیر ہے مرزا کہ آج — سو برس کے بعد عالم نوحہ خواں ہے میر کا

مرزا کی شاعری کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف اپنے جذبات و خیالات نظم کرتے تھے جو ایک فطری شاعر میں ہونا چاہیئے۔ غالب کی زمینوں میں انہوں نے خوب خوب گل کھلائے ہیں، افسوس کہ وہ سب کلام دستیاب نہیں ہو سکا مگر جس قدر ملا ہے ملاحظہ ہو۔

(۲)

جسے ہو حسن ظن تم سے کسی سے بدگماں کیوں ہو — تمہارے عہد میں بدنام دور آسماں کیوں ہو

کسی پر جان جاتی ہو تو ضبط شوق مشکل ہے — نہ ہو قابو اگر دل پر تو کہنے میں زباں کیوں ہو

اس شعر میں جو ٹکڑے ہیں مرزا صاحب کی خاص پسند کے ہیں

جو دل مطلوب ہے اچھا یہ تمہید وفا کیسی — ستم مقصود ہے بہتر فریب امتحاں کیوں ہو

مری بیتابیوں کا حال غیروں سے نہ کہنا تھا — تم ایسے ہو تو پھر کوئی کا راز داں کیوں ہو

دل آزاری کو جس کی دلربائی ہم سمجھتے ہوں — توقع اس سے کیسی پھر وہ ہم پر مہرباں کیوں ہو

یہ دونوں شعر دیکھئے۔

حقیقت میں مخاطب ہو تمہیں شکر و شکایت کے
تمہیں تم جس کے ہو وہ شکوۂ سنجِ آسماں کیوں ہو

فرشتو! جب کسی سے ہو توقع سعی لاحاصل
مرے اعمال میں لکھ دو وہ محنت رائگاں کیوں ہو

کہیں گے حالِ دل مرزا کبھی رمز و کنایت میں
ملالِ خاطرِ احباب اندازِ بیاں کیوں ہو

مرزا غالب کی مشہور غزل پر مرزا کی طبع آزمائی دیکھئے۔

(۳)

راحتیں طولِ عرض کی صرفِ درماں ہو گئیں
زندگی جن مشکلوں سے تھی وہ آساں ہو گئیں

صورتیں اُمید کی خواب پریشاں ہو گئیں
سامنے آنکھوں کے آئیں اور پنہاں ہو گئیں

اُن سے کیا لطف تعلق اُن سے کیا وابستگی
غیر کے ماتم میں جو زلفیں پریشاں ہو گئیں

ناخنِ وحشت نے سینے پر جو کیں گلکاریاں
فصلِ گل میں زینتِ چاکِ گریباں ہو گئیں

سینکڑوں رخنے کئے پیدا درو دیوار میں
شوق کی نظریں رقیبِ چشمِ درباں ہو گئیں

بے مروت سی جو قبریں کوچہ وحشت میں تھیں
وہ بھی آخر صرفِ استحکامِ زنداں ہو گئیں

کھل گئے جیں جب سے اُن کی بدخوئی کے بھید
جن اداؤں کو چھپاتے تھے نمایاں ہو گئیں

دل میں اب کیا رہ گیا ہے نا اُمیدی کے سوا
آرزوئیں خون ہو کر نذرِ مژگاں ہو گئیں

مقطع ملاحظہ ہو۔

چند باتیں وہ جو ہم زندوں میں تھیں ضرب المثل
اب سنا مرزا کہ وردِ اہلِ عرفاں ہو گئیں

(۴)

نگاہِ مہر ہے عالم کے اجزائے پریشاں پر
ہر اک ذرہ کا حق ثابت ہے خورشیدِ درخشاں پر

فنا کے بعد بھی چھوٹا نہ میں قیدِ تعلق سے
مری تصویر کھنچوا دی گئی دیوارِ زنداں پر

بہل ہی جائیگا دل شہر کی گلیوں میں آ نکلے صبح
نہیں آوارگی موقوف کچھ سیرِ بیاباں پر

کبھی تو اس طرف بھی کوئی بھولے سے نکل آئے
کہاں تک بے کسی رویا کرے گورِ غریباں پر

دکھاتے جوشِ وحشت کے مزے تجھ کو بھی اے ناصح
مگر کیا کیجئے قابو نہیں تیرے گریباں پر

مجھے ذوقِ جنوں نے دیکھ رخصت ذوقِ خواری کی
کئے ہیں بارہا احسان اطفالِ دبستاں پر

سمجھتے کافرانِ عشق کی دشواریاں یہ بھی
اگر طاعت بتوں کی فرض ہوتی اہلِ ایماں پر

کہیں اب کچھ ہم ایسے شعر مرزا جن میں جدت ہو
کہاں تک حاشیے لکھا کریں غالب کے دیوان پر

غالب کی مشہور غزل "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا" اس پر مرزا کی لاجواب غزل مگر پتہ نہیں میں نے خود اُن کی زبان سے سُنی تھی ایک شعر یاد رہ گیا۔

عشق اور عشق سے منظور کا ہو چارہ کار
درد کا بھی کہیں ممکن ہے دوا ہو جانا

چھوٹی بحروں میں مرزا کی روانی طبیعت کا اندازہ کیجئے۔

ابر جب جھوم جھوم کر آتے
دل جو امڈے ہوتے تھے بھر آتے

دل میں طوفان اُٹھاتے تھے نالے
لب تک آئے تو بے اثر آتے

ذیل کے شعر میں کوٹھے کا استعمال اور شعر کی بلندی دیکھئے۔

کھینئے کیا آسماں سے ٹھہری
آپ کوٹھے سے کیوں اُتر آتے

یہ شعر بھی داد طلب ہے۔

جس کو برسوں ہنسی نہ آتی ہو
اُس کو ناصح کی بات پر آتے

چند شعر ایک طرح میں اور سنئے۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اُسی کافر کی ادا یاد آئی

تم جدائی میں بہت یاد آئے
موت تم سے بھی سوا یاد آئی

لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا — لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

ردیف وہی قافیہ اور بحر مختلف

روشِ وحش و طیر یاد آگئی — دست وحشت کی سیر یاد آئی

زاہدو آج ہم کو پھر وہ شے — جس سے تم کو ہے بیر یاد آئی

دیکھ کر شاہد ادا اُن کو — لالہ و گل کی سیر یاد آئی

اب چند غزلیں سُن لیجئے اس لئے نقل کئے دیتا ہوں کہ اُردو کے یہ جواہر پارے محفوظ رہیں اب نہ مرزا ہوں گے نہ یہ نغمے آپ سُنیں گے ممکن ہے کہ اِس دور کے جدت پسند شعرا اس کو پسند نہ کریں کہ ان اشعار میں وہی پرانے محاورے ہیں اور پُرانی زبان، نہ ترکیبوں میں ندرت نہ الفاظ میں جدت نہ تخیّل میں اپنی پرواز کہ طائرِ عقل بھی گم ہو جائے۔

لڑکے جاتے ہو تو اِک تیغ لگاتے جاؤ — ہاتھ اُٹھاتے ہو تو یوں ہاتھ اُٹھاتے جاؤ

حالِ دل سچ بھی کہوں میں تو مجھے جھٹلا دو — بھید کھلتے ہوں تو کچھ بات بناتے جاؤ

وعدہ شام کرو صبح کو جاتے ہو اگر — کوئی بے وقت جو سوتے تو جگاتے جاؤ

کہیں بدنام نہ ہو جاؤ پشیماں کیوں ہو — ہاتھ ملتے ہو تو منہدی بھی لگاتے جاؤ

یوں چلو راہِ وفا میں کہ نہ پائے کوئی — جو نشاں راہ میں ہیں ان کو مٹاتے جاؤ

میرؔ کا نام تو روشن ہے مگر اے مرزا — اِک چراغ اور سرِ راہ جلاتے جاؤ

چارہ گر مشورہ ترکِ وفا دیتے ہیں — زہر دیتے ہیں یہ ظالم کہ دوا دیتے ہیں

مجھ کو یہ خوف کہ تم بھی کہیں اُن میں سے نہ ہو — چاہنے والوں کو جو لوگ دعا دیتے ہیں

کان تک اس کے نہ پہنچے تو نہ پہنچے فریاد
سننے والوں کا کلیجہ تو پکا دیتے ہیں

الحذر شیخ برے ہوتے ہیں پینے والے
اچھے اچھوں کو یہ دھوکے سے پلا دیتے ہیں

تنگیٔ عیش میں ممکن نہیں ترکِ لذت
سوکھے ٹکڑے بھی تو فاقوں میں مزا دیتے ہیں

یادِ ایامِ جوانی ہے بہت درد انگیز
وہی اچھے جو یہ افسانے بھلا دیتے ہیں

جب غزل کوئی نئی کہتے ہیں مرزا صاحب
کسی حیلے سے انہیں جا کے سنا دیتے ہیں

برے یا بھلے ہوں لہو رونے والے
یہی لوگ ہیں سرخرو ہونے والے

ترے چرخ پر پا ہوئے حشر کیا کیا
مزاروں میں سویا کئے سونے والے

ہے خوش نصیبی شہیدانِ غم کی
مزاروں سے ہنستے اٹھے رونے والے

شبِ وعدہ جاگیں گے ہم بھی سحر تک
ذرا سن رکھ او شام سے سونے والے

کہاں تک تو برسے گا اے ابر کھل جا
ابھی دیر تک روئیں گے رونے والے

ہمیں کیا کام میرے امتحاں سے
نپٹ لینے دو مجھ کو آسماں سے

تمنا ہے کہ اے ذوقِ اسیری
قفس میں اڑ کے پہنچوں آشیاں سے

نگاہیں میری نظروں کی طرف ہیں
کسی نے کہہ دیا کچھ پاسباں سے

کہیں گے اضطرابِ شوق کا حال
سنیں گے آج کچھ ان کی زباں سے

اسی پر منحصر تھی زندگی کیا
گھٹا جاتا ہے دم ضبطِ فغاں سے

مرے دل میں ترا کیا کام اے شوق
نکل کم بخت اس اجڑے مکاں سے

کہاں مرزا کہاں اے آسماں تو
یہ کیسی بل اس ضعیف و ناتواں سے

بنجلتے جو بگڑ کے وہ تقدیر چاہیئے
خانہ خرابیوں میں بھی تاثیر چاہیئے

میں مرگ ناگہاں کا طلبگار ، ہجر میں
اور اقتضائے شوق کہ تاخیر چاہیئے

ممکن تو ہے کہ ضعف میں آنکھیں کھلی رہیں
پیش نگاہ آپ کی تصویر چاہیئے

خانہ خرابیوں کی تلافی ضرور ہے
زنداں بقدر وسعت تعمیر چاہیئے

شکووں کا بھی انداز نہ ہو حسن طلب کا
ہاں اے دل بے تاب رہے پاس ادب کا

غافل کبھی اندیشۂ فردا نہیں کرتے
موقوف ہے اس وقت پہ جو کام ہے جب کا

گو ان سے اشاروں ہی میں ہوتی رہیں باتیں
محفل میں یہ مضمون ہے سمجھا ہوا سب کا

ارباب فنا وجد میں ہیں گرم ہے محفل
ہے شمع کا ڈھلتا ہوا جوبن بھی غضب کا

کہتے تو ہیں احباب کہ ہم بھی کبھی خوش تھے
کچھ یاد نہیں اب کہ یہ مذکور ہے کب کا

مرزا کبھی کچھ اپنی زباں سے نہ کہے گا
ہر چند کہ حسرت زدہ ہے بوسۂ لب کا

جو حیات چند روزہ کا ہم اعتبار کرتے
ہمیں اور کام کیا تھا ترا انتظار کرتے

شب ہجر کی سیاہی نے چھپا دیئے ستارے
کچھ انہیں سے دل بہلتا جو انہیں شمار کرتے

وہ کلام جس پہ مرزا کو بجائے خود ہے نازش
کسی نکتہ چیں کی باتوں پہ اسے نثار کرتے

سن اے شوق شہادت یہ نشان کوئے قاتل ہے
در و دیوار پر نقش و نگار خون بسمل ہے

غلط ہے آدمی کو ہوا اگر دعوائے ہشیاری
تیور و وضع سے دیوانہ پابند سلاسل ہے

خوشا تقدیر اُن کی مر گئے جو راہ میں تیری
خوشا حال اُن شہیدوں کا وفا خود جن کی قائل ہے

ضعیف العقل ہے انساں کہ ہے جویائے آزادی
یہ حسرت ہی حقیقت میں دلیل ضعف کامل ہے

نہیں مطبوع اُن کو اختلاط شمع و پروانہ
یہ گستاخی سر محفل خلاف داب محفل ہے

مری معجز بیانی مجھ سے عاجز ہو کے کہتی ہے
بیاں ہونا تری دشواریوں کا سخت مشکل ہے

نہ رکھ مرزا کو اے شوقِ زیارت دور مشہد سے
اُسی در پر اسے پہنچا دے جس در کا یہ سائل ہے

ہم اگر شیخ و برہمن سے اٹک جائیں گے
کفر و ایماں کے دوراہے پہ بھٹک جائیں گے

ساقیا دور ہمارا ہے ہمیں کو دینا
ابھی اتنی نہیں پی ہے کہ بہک جائیں گے

خلد و کوثر سے نکل چلنے دے اے راہنما
آگے بڑھ کر کہیں ٹھہریں گے جو تھک جائیں گے

جوہر دل کو مرے کھلنے دو سیہ بختی میں
شب تاریک میں تارے سے چمک جائیں گے

گفتگو پر نہیں اظہار تمنا موقوف
مرے چپ بیٹھنے پر وہ بھی کھٹک جائیں گے

ہم جو دیں اگلے مضامیں کو طراوت مرزا
پھر یہ کمہلائے ہوئے پھول مہک جائیں گے

فکر نام و ننگ میں کیا کوئی دیوانہ رہے
جب نہ ہوں ہم خلق میں کیوں میرا افسانہ رہے

وضع رندانہ ہو لیکن ٹھیک ہوں تیرے اصول
ہے وہی فرزانہ جو ظاہر میں دیوانہ رہے

ہم کو اے مرزا نہیں دنیا و مافیہا سے کام
ہم جہاں کے پینے والے ہیں وہ میخانہ رہے

اب یہ صورت ہے کہ ہیں سر تا قدم تصویر غم
اک وہ عالم تھا کہ تھے ہم منکر تاثیر غم

خاک میں سب حسرتیں تیری ملا دوں تو سہی
اے دل ناشاد میں دونگا تجھے تعزیر غم

میرے رونے پر وہ ہنستے ہیں نہ ہے رونا مرا
میری غمگینی سے وہ خوش ہیں خوشا تقدیر غم

بسکہ انداز بیان دشوار و معنی خیز ہے
ساکت و صامت ہے وہ جس نے سنی تقریر غم

اس طرح گذرے خوشی و ناخوشی یہ دو دن زیست کے
منہ پر آثار تبسم دل میں زخم تیر غم

جنبش ابرو سے تم کو سہل انکار وفا
اوس سے پوچھ جس کے دل پر چل گئی شمشیر غم

ماتم اہل وفا میں صرف آرائش ہیں وہ
یہ توقع کس کو تھی مرزا نہ ہے توقیر غم

سامنے اوس کے تڑپنے کی جو حسرت دل میں ہے
اک رمق جاں سو بہانے سے دل بسمل میں ہے

ہجر میں جینا اگر مشکل ہے اچھا یوں سہی
جان دیدیں گے یہ آسانی تو اس مشکل میں ہے

بے حجابی آپ کی بے امتیازی غیر کی
مجھ سے سنیئے جو تکلف آپ کی محفل میں ہے

دشت نجد و ساربان و ناقہ و بانگ جرس
ہیں یہ سب سامان تو لیلیٰ پردہ محمل میں ہے

اوس سے اب قطع نظر کرنے لگے اہل کمال
وہ جو نکتہ امتیاز ناقص و کامل میں ہے

گوشۂ مرقد ہے مرزا تیرہ و تاریک و تنگ
یہ تو سب کچھ ہے مگر آرام اسی منزل میں ہے

جب ہم نہ تھے تو نور کا تیرے ظہور تھا
پھر ہم سے یہ حجاب تجھے کیا ضرور تھا

آخر ہجوم یاس میں کھویا گیا غبیر
اب تک تو میرے پاس دل ناصبور تھا

برباد کر کے مجھ کو نہ ہوں منفعل حضور
ہیں آپ معترف ہوں کہ میرا قصور تھا

ٹکرا کے سر کو ہم پس دیوار مر گئے
وہ کہتے ہیں دماغ میں اس کے فتور تھا

نازک ہوا اس قدر کہ نہ اٹھا کسی پہ ہاتھ
تلوار باندھنا تمہیں پھر کیا ضرور تھا

دکھلی مرے خدا نے گناہوں کی میرے شرم
زاہد کو اپنے زہد یہ کتنا غرور تھا

دل دے کے ان بتوں سے امید وصال واہ
مرزا یہ کیا سمجھ تھی یہ کیسا شعور تھا

اون کے اخلاص کی یہ حد ہے کہ خود ہم نہ رہے
روح و قالب ہی ضدیں پڑ گئیں باہم نہ رہے

اضطراب دل شوریدہ سے کہتا ہے یہ ضبط
سلسلہ شوق کا تجھ سے کہیں برہم نہ رہے

کاش بیکار ہوں اسباب ستم میرے بعد
تیغ و خنجر میں تیرے آب ہو دم نہ رہے

حشر برپا ہو اگر حضرت زاہد پی لیں
یہ سماں خاک میں مل جائے یہ عالم نہ رہے

وہ جواں ہو کے خدا جانے کریں گے کیا قہر
کم سنی میں فلک پیر سے جو کم نہ رہے

اٹھ جاتے ہیں مری جان کو رو کر احباب
دو گھڑی آپ شریک صف ماتم نہ رہے

بسکہ آمادہ عبرت رہے ہے نگاہ انساں
نور بینش ہو فنا چشم اگر نم نہ رہے

رکھتے ہیں حسن ظن یہ بتوں کی وفا سے ہم
جیسے کہ مانگتے ہیں دعائیں خدا سے ہم

اے ذوق بادہ توبہ کو اذن شکست دے
بے چین ہیں تغیر آب و ہوا سے ہم

وہ تو یہ جانتا ہے کہ ہم کب کے مر چکے
جیتے رہے فراق میں اوسکی بلا سے ہم

ہر چند قول ناصح مشفق غلط نہیں
کچھ ہو مگر ملیں گے اسی بے وفا سے ہم

شروع موسم گل میں اسیر دام ہونا تھا
ہمارے شوق بے حد کا یہی انجام ہونا تھا

پیام موت کیوں آیا ابھی سے مرنے والوں کو
کوئی دن اور اون سے نامہ و پیغام ہونا تھا

جگہ دی تھی اسی سے سر پہ دستار فضیلت کو
اسے اک دُور رہن بادۂ گلفام ہونا تھا

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم
ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مر جانے سے

دیکھ اس طرح بھی مل لیتے ہیں ملنے والے
شمع کا بس نہ چلا بزم میں پروانے سے

جیتے جی اُس کے نہ کہتے مگر اب کہتے ہیں
لذت غم نہ رہی غیر کے مر جانے سے

غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ
چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کیے بغیر

زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو
بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے بغیر

ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں
باز آئیں گے نہ وہ مرا چرچا کیے بغیر

رُسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب میں تمہیں رسوا کیے بغیر

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھئے دیکھئے اک آن میں کیا ہوتا ہے

نالہ رکتا ہے تو سرگرم جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے تو بے درد خفا ہوتا ہے

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا
دم نکلتے ہی میں کم بخت مزا ہوتا ہے

تا لبِ گور پہنچ جاتے ہیں مرنے والے
وہ بھی اس وقت کہ جب شوق رسا ہوتا ہے

آہ میں کچھ اثر ہو تو شرر بار کہوں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

کس قدر معتقد حسن مکافات ہوں میں
دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے

شوق اظہار اگر ہے تو مرے دل کو نہ توڑ
اسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

امراؤ جان ادا کا تخلص ادا تھا اس ناول میں اکثر غزلیں اس کے نام سے کہی ہیں، ایک غزل ملاحظہ ہو۔

شب فرقت بسر نہیں ہوتی نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
شور فریاد تا فلک پہنچا مگر اوس کو خبر نہیں ہوتی
جان دینا کسی پہ لازم تھا زندگی یوں بسر نہیں ہوتی
اب کس امید پر نظر میری شکوہ سنج اثر نہیں ہوتی
غلط انداز ہی سہی وہ نظر کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی
اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی۔ خبر نہیں ہوتی

اپنے صورت گر پوچھوں میں اگر مقدور ہو کیا بنایا تھا تو نے منانے کے لئے
ہجر کی شب کے بنانے میں بھی تھی اک مصلحت طول آخر چاہیے تھا کچھ زمانے کے لئے

اب سنا ہے کہ جفا سے بھی پشیماں ہیں وہ اور پھر آہ کی تاثیر سے کیا ہوتا ہے
گوش مشتاق سخن اول متمنی وصال تو ہی کہدے تیری تصویر سے کیا ہوتا ہے

مرقع لیلیٰ مجنوں میں ایک غزل مادہ پرستوں کی تردید میں کہی ہے۔

کھول تو آنکھ ذرا دیکھ تماشا کیا ہے وہم ہے یا کہ حقیقت ہے یہ دنیا کیا ہے
تو یہ کہتا ہے ہیولیٰ کے یہ سب دھوکے ہیں پھر ہیولیٰ بھی تو دھوکا ہے یہ دھوکا کیا ہے
پھر کہا تو نے کہ دیکھا نہیں خالق کو کبھی اک ذرا غور تو کر جی میں یہ کہتا کیا ہے

تو نے دیکھا ہے انرجی و ہیولیٰ کو کبھی
پھر جو قائل ہے تو اوس کا تجھے سودا کیا ہے
بے بنائے تو کسی کے نہیں بنتا کچھ بھی
تجربہ ہم کو بتا دے کہ بتانا کیا ہے
مان لے تو کہ نہیں کوئی بنانے والا
پھر قیاس اپنا ذرا دیکھ تو بنتا کیا ہے
اوس کا ہونا نہیں واجب تو نہیں کچھ ممکن
پھر اگر کچھ بھی نہیں ہے تو یہ جھگڑا کیا ہے

خواجہ وزیر کی مشہور غزل ہے۔

"چلا ہے او دل راحت طلب کیا شاد ماں ہو کر"

مرزا صاحب کا دو غزلہ سن لیجئے اور اس باب کو ختم کیجئے یہ دونوں غزلیں طولانی تھیں، میں نے اشعار انتخاب کر لئے ہیں طرح کا فیض تھا کہ مرزا صاحب اُسی طرف جھک گئے اون کے مذاق سے الگ جو شعر تھے وہ خارج کر دیئے گئے (زیادہ تر)

ادائے شرم پر نازاں ہو نظروں سے نہاں ہو کر
ستم کرتے ہو در پردہ شریک آسماں ہو کر
رگ و پے میں سمایا عشق ربط جسم و جاں ہو کر
رہی یہ آگ میرے تن میں مغز استخواں ہو کر
ہوئی ترک وفا لیکن یہ ہے پاس وفا اب تک
فلک کا شکوہ کرتا ہوں کسی سے بدگماں ہو کر
زلیخا کاش تیرا جذبہ دل بے اثر ہوتا
نہ بکتے حضرت یوسف اسیر کارواں ہو کر۔
نہ پوچھو حسرت بختی کشتان عشق و رسوائی
در بتخانہ پر رہتے ہیں سنگ آستاں ہو کر
محیط آسماں نے ہم کو آخر گھیر کر مارا
لگاتے ہر طرف سے تیر ظالم نے کماں ہو کر
ادائے شرم کے سر خون ہوتا ہے ہزاروں کا
ستم کرتے ہیں تیر اُن کی نگاہوں کے کماں ہو کر

غزل اس رنگ میں اک اور بھی کہنی پڑی مرزا
نہیں رکتی طبیعت اہل معنی کی رواں ہو کر

مقامِ عشق پہ فائز ہوئے ہم بے نشاں ہو کر — کسی پردہ نشیں کے گھر میں پہنچے لامکاں ہو کر

لگے تیر دل پہ تیری ابرو نے کماں ہو کر — کلیجے پر پڑیں نیچی نگاہیں برچھیاں ہو کر

خموشی کی ادائیں حسنِ صورت سے یہ کہتی ہیں — کہ ہے تصویر کے پردے میں اک شوخی نہاں ہو کر

اگر وہ بے حجابانہ نکل آتا تو کیا ہوتا — کیا ہنگامہ برپا جس نے پردہ میں نہاں ہو کر

ہم اوس منزل میں پہنچے لیکے اک دل مثلِ آئینہ — کدورت رہ گئی پیچھے غبارِ کارواں ہو کر

غمِ جاوید یعنی دردِ فرقت میرا حصّہ ہے — عدو نے بات ہی کھوئی شریکِ امتحاں ہو کر

حیا کی شوخیوں سے اُٹھتے اُٹھتے جھک گئیں نظریں — مری قسمت سے اُن کے تیر بھی آئے کماں ہو کر

تیرے ہر لفظ پر شوخی سے اُس نے نکتہ چینی کی
غزل کیسی کہی تھی تو نے مرزا نکتہ داں ہو کر

قصائد

مرزا صاحب نے اس صنف میں بھی کمال دکھایا ہے خوب خوب قصیدے کہے ہیں میں نے اون کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک مجموعہ قصائد اون کے پاس دیکھا تھا۔ مدت کے بعد ایک دن پوچھا وہ مجموعہ کہاں ہے کہنے لگے کوئی صاحب لے گئے ہوں گے، لکھنؤ میں انجمن امامیہ کے نام سے ایک جماعت عرصہ تک قائم رہی جس کے مقاصد میں یہ بھی تھا کہ آئمہ کی ولادت کی تاریخوں میں نواب اکرام اللہ خاں کے امام باڑہ میں قصیدہ خوانی کی صحبتیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ جس میں بیشتر اساتذہ سخن شریک ہوتے تھے اوس کے پہلے دور میں مرزا صاحب نے بھی اراکین بزم کے اصرار پر قصائد پڑھے ہیں اور داد سخن لی ہے۔

مدت ہوئی کہ جام جم ایک رسالہ غالباً نواب مرزا اوج کی ادارت میں نکلتا تھا اوس کے اکثر نمبروں میں مرزا صاحب کا کلام ہوتا تھا باوجود کوشش کے وہ رسائل دستیاب نہیں ہوتے تین چار ورق پھٹے ہوتے ایک دوست سے مل گئے جس میں مرزا صاحب کے دو قصیدوں کی تشبیبیں تھیں وہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

در فخر خود و مرثیہ بعض احباب و موعظت

لکھ مری مدح و ثنا اے قلم زود رقم | کہ نہیں مجھ سا زمانے میں کوئی معجز دم

تا کہ ہو طبع خداداد کے پیدا جوہر — کیف و کم سے مرے آگاہ ہوں اہل عالم

کون ہوں میں مجھے کیا سمجھے ہیں یہ مردہ پرست — ملک انشا میں مسلّم ہے مجھے مسند جم

میں ہوں وہ نقطہ کہ ہے منشاے دور پرکار — میں ہوں وہ خطہ کہ جو ہے محور آرامش و رم

در و دیوار شکستہ کے مٹے نقش و نگار — مجھ سے پیدا ہوتے آثار صنادید عجم

کون ہوں میں وہ گل سر سبد گلشن دہر — جس مستکمل قوت ہوئی خود قوت نہم

فائدہ ہرزہ سرائی سے نہیں اے مرزا — یاد احباب سے محفل میں بپا ہے ماتم

خوں چکاں صفحۂ قرطاس ہوا سر تا سر — بسکہ تشدّت سے لہو روئی ہے چشم پرنم

دل پہ اک داغ محبت ہے نشان دشمن — بھول جاؤں تمہیں کس طرح سے اے اہل کرم

اے فلک تجھ کو مری ہمت عالی کی قسم
تجھ سے رتبہ میں سوا ہیں کہ نہیں اہل ہمم

کس نظر سے ہوا آلودہ دشمن ارباب کمال — کیا تری شان بڑھیگی جو یہ مر جائیں گے کم

اس سے کیا نفع کہ ہنستوں کو رلاتا ہے تو — اس سے کیا نفع کہ ہر گھر میں بپا ہے ماتم

اٹھ گئے کیا لوگ تھے جن سے ہوتی دنیا خالی — جن کے ماتم میں سیہ خانہ ہے سارا عالم

اس کا کیا غم کہ چلے جاتے ہیں جانے والے — ہاں یہ حسرت ہے کہ افسوس رہے جاتے ہیں ہم

قبل احباب مجھے اے کاش ہمیں موت آتی — کون روئے گا ہمیں جب نہ رہیں گے ہمدم

قدرداں جب نہ رہے ہیچ ہے اپنا جینا — کیا سمجھتا ہے ہمیں کوئی کہ کیا چیز ہیں ہم

بے حقیقت ہے یہ نیرنگ جہان فانی — اعتباری ہیں یہ مفہوم وجود اور عدم

بند کر آنکھ اگر ذوق تماشا ہے تجھے — غور سے دیکھ کہ اک دم میں نہ شادی ہے نہ غم

دیکھ تو اب نہ ستارے ہیں نہ وہ ان کی جھلک — دیکھ تو اب نہ فلک ہے نہ فلک کا وہ خم

نیّرین اب کہیں طالع ہیں نہ وہ انکا نور — ظلمتِ بخت ہے اصغر ہے زاب وہ اعظم
نہ عناصر نہ موالید ثلاثہ کا ظہور — جنس عالی ہے نہ سافل ہے نہ وہ کیف نہ کم
نہ زمیں ہے نہ بیاباں نہ وہ دشتِ و جبل — نہ مکیں ہیں نہ مکاں ہیں نہ حشم ہیں نہ خدم
نہ وہ سبزے کی طراوت نہ وہ موجِ صرصر — نہ گلوں کی وہ نزاکت نہ وہ لطفِ شبنم
نہ وہ نرگس کہ جسے کہتے تھے چشمِ محبوب — نہ وہ سنبل کہ جسے کہتے تھے زلفِ پر خم
نہ وہ بادل کا گرجنا نہ وہ بجلی کی چمک — نہ وہ پانی کا برسنا نہ ہوائے پُر نم
نہ وہ دریا کا تلاطم نہ جیالوں کی نمود — عالمِ آب ہے نایاب نہ قطرہ ہے نہ یم
نہ وہ بلبل کے ترانے نہ وہ صوتِ قمری — نہ وہ موسیقیِ گلشن ہے نہ وہ زیر نہ بم
سبز شاخوں کی نہ وہ باغ میں سوز و حرکت — آس وہ موجِ ہوا کی ہے نہ وہ تال نہ سم
از زمیں تا بہ فلک ہوگئی ہر شئے پابند — از ثریٰ تا بہ ثریا ہوئی ہر چیز عدم
ماسوا اللہ ہر اک چیز ہے فانی غافل — ایک باقی ہے فقط ذاتِ خدائے عالم
ذاتِ واجب کے سوا جس سے ہے منسوب وجود — نسبتِ خاص سے ہے عام یہ اطلاقِ اعم
یہ بھی اک وصفِ اضافی ہے کہ ہم ہیں موجود — مرتفع ہو یہ اضافت تو پھر تم ہو نہ ہم
جوہر اپنا کہ ہے معروضِ فنا فی الجہتین — ہے وہ اک ہستیِ موہوم میانِ دو عدم
زہر ہے زہر سمجھتے ہیں جسے ہم تریاق — لذتِ عیش کہ وہ ہے متغیر بہ الم
اپنی دولت پہ عبث غرہ ہے تجھ کو منعم — تو سمجھتا ہی نہیں جوہر اربابِ ہمم
متاثر نہ لذاتِ جہاں سے ہرگز — فی الحقیقت ہے یہ لذت اثرِ نقشِ درم
جو کہ ہے خارجِ قسمت نہ ملے گا ہرگز — سود در سود اصل ہے عملِ جذبِ اصم
دیکھ عاقل نہ خطائیں کا ہو تو زنہار — منع ہیں بخل و ریا دونوں بنصِ محکم

نفع منظور ہو تو بانٹ دے تو اس کا مال
جو کہ تقسیم سے حاصل ہو وہ ہے اصل رقم

جمع و تفریق میں اموال کی کیا ہے مصروف
صفر ہے صفر بیک ضرب قضائے مبرم

طرح کر مس کو مساکین پہ اے اہلِ ہوس
دیکھنا ہو جو تجھے جلوہ اکسیر کرم

دیکھ مالوف نہ ہو موسیقی عیش سے تو
یہ ہے وہ راگ کہ جس راگ میں ہے تال نہ سم

چند روزہ ہے حیات اس پہ نہ کر فکر کمال
پانچ دن میں تو کبھی صاف نہ ہوگی سرگم

تجھ سے ممکن ہو تو ہو موجب تالیفِ قلوب
سانس اکھڑ جائیگی دم بھر میں غنیمت ہے یہ دم

تان کیا لیتا ہے ناداں یہ ہے اصل اصول
فرصتِ عمر کے آگے ہے بہت بعدِ نغم

تجھ میں جوہر نہیں تو ہیچ ہے عالی نسبی
تجھ کو کیا نفع اگر شاہ ہوں تیرے اب و ام

نوعِ انسان میں ہے ہر فرد پیمبر زادہ
سب کی ماں حضرتِ حوا ہیں پدر ہیں آدم

جاہ و ثروت سے جو حاصل ہو تو یہ حاصل ہو
تیرے تابوت کے ہمراہ چلیں طبل و علم

نفع دنیا سے اسے بھی تو سمجھ مستبعد
کوئی عہد اس زنِ قحبہ کا نہیں مستحکم

جاہ و ثروت کو زمانے میں نہیں استقلال
چادرِ گور بھی آخر نہ ہوئی مسندِ جم

دور کر کعبۂ دل سے ہوسِ مال و منال
اختراعات سے ہیں وہم کے تیرے نہ صنم

کس لئے تجھ کو بنایا تھا کیا کیا تو نے
دیکھ تو نفس پہ کیا کیا نہ کئے تو نے ستم

درسِ توحید سے پیدا ہوا اگر ذوق صحیح
چاشنی موت کی ہو تیرے لئے طعمِ نعم

غور کر غور کہ دنیا ہے طلسم باطل
قصرِ ہستی کی بنا سست ہے یا مستحکم

برزخ و حشر کا ساماں مہیا کر تو
فکر کر فکر کہ ہیں پیش مہمات اہم

عشق پیدا ہوا اگر دل میں تو حاصل ہو کمال
عشق وہ عشق کہ جس عشق میں لذت ہے الم

موت اس راہ میں سرمایہ خواب آرام
خواب وہ خواب کہ جس خواب کی تعبیر ارم

شکایت زمانہ و حال خود

کوئی فلک سے یہ پوچھے کہ او ستم ایجاد / ہم ایسے خاک نشینوں کو کیوں کیا برباد
ہمیں بنا کے بگاڑا تو کیا ملا تجھ کو / مگر اسی پہ ہے موقوف طرح کون و فساد
بُرے ہیں ہم مگر ایسے بُرے بھی کم ہوں گے / کسی زمانے کے اچھے ہمیں کریں گے یاد
وہ ہم خراب خرابات ہی سہی لیکن / ہمارے دم سے ہے آباد یہ خراب آباد
جو دیکھنا ہو تو اہل جہاں ہمیں دیکھو / کہ ہیں زمین کے پردے ہیں ہم سے آدم زاد
ہماری حالت افسردگی ہے قابل دید / مثال غنچہ تصویر ہے دل ناشاد
بگاڑ پر بھی کروروں بناؤ پیدا ہیں / مٹے ہوئے ہیں مگر پھر بھی ہم ہیں نقش مراد
جو ہم کو جانو تو جانو مشیت تقدیر / جو ہم کو سمجھو تو سمجھو حقیقت ایجاد
نہ ہوگا ہم سا بھی دنیا میں کوئی بے پروا / کہ باوجود علائق ہیں بندۂ آزاد
دل آئینہ بظاہر ہیں گو غبار آلود / کہیں جہاں میں نہ دیکھو گے ہم سے پاک نہاد
جنوں کا جوش ہے کہتا ہوں کیا خدا جانے / کوئی یہ فخر کا موقع ہے اے دل ناشاد
پیام مرگ سناتی ہے دل کی مایوسی / نوید امن ہے اے آرزو مبارک باد
اسیر غم ہوں رہائی محال ہے میری / اجل بھی آئے تو پوری نہ ہو میری میعاد
ہجوم یاس میں شیون سے جی بہلتا تھا / مگر وہ دل نہ رہا اب نہ طاقت فریاد
کبھی کبھی یہ اسیری میں یاد آتا ہے / کسی زمانے میں رکھتے تھے اک دل آزاد
جنوں میں اپنی خودی سے بھی ہم ہوئے باہر / وہاں ہیں اب کہ جہاں آدمی نہ آدم زاد
سوائے یاس کوئی میرے آس پاس نہیں / سناؤں کس کو کہ سنتا نہیں کوئی فریاد

وہ آہ سینۂ سوزاں میں ہے اگر نکلے
ابھی خراب ہو بنیادِ چرخِ کج بنیاد

دلِ نشاط پریشاں کریں مرے نالے
دماغِ عیش معطل کرے مری فریاد

میں کیا کروں مری کوشش میں کچھ اثر ہی نہیں
بگڑ کے مجھ سے مقدر ہے مائلِ بیداد

فلک ہے میری اُمیدوں کے قتل پر مامور
کہ جیسے شرع میں ہو کافروں پہ حکمِ جہاد

اسیر یاس کے ہاتھوں میں یوں ہے حسرتِ دل
اجل گرفتہ کو لے جائے جس طرح جلاد

ہر ایک دو سے مقصود ہے مری گردش
مرے مٹانے کو پھرتا ہے چرخِ کج بنیاد

جو کچھ بھی ملنے کی اُمید بخت سے ہوتی
تو مانگتا نفسِ چند مہلتِ فریاد

جہاں یک طرف اہلِ جہاں بھی دشمن ہیں
بلا نصیب ہوں لیکن ہیں سینکڑوں حُساد

اثر یہ کرتی ہے نیکی مری بدی ہو کر
کہ جس کا دوست بنوں میں اسے ہو مجھ سے عناد

جہاں عدو ہے مرا دوستی کے پردے میں
وہ کیا کرے کہ طبیعت میں تمرکز ہے فساد

جنوں بھی مگر اتنا تو ہوش ہے مجھ کو
لگا رہا ہے رگِ جاں پہ نیشتر فصّاد

گھرا ہوا ہوں بلاؤں میں چار سمت سے میں
مگر یہ کہتی ہے ہمت کہ مرحبا بادا باد

اگر ہے ہمتِ عالی تو قصد محکم رکھ
کہ جیسے کوہ پہ قائم ہو قلعہ فولاد

جہاں تضادِ طبیعی ہو میل کیا ہو گا
ملے مگر نہ ملے خاک و آب و آتش و باد

ہو اعتدالِ مزاجِ بشر میں کیا ممکن
کہ اصلِ مبدءِ فطرت سے جمع ہیں اضداد

وہی ہیں ہم کہ بنائے گئے ہیں مٹنے کو
وہی ہیں ہم کہ ودیعت ہے ہم میں طرحِ فساد

وجود اور عدم دونوں ساتھ ہیں اپنے
یہ چند روزہ ہے اور وہ ہے تا بہ یومِ تناد

بگاڑ کر ہمیں اک دن بنائیں گے پھر بھی
یقین جان کہ مہمل نہیں ہے لفظِ معاد

سمجھ لے تو کہ یہ اک دن ضرور ہونا ہے
یقین جان کہ باطل ہے مذہبِ سمراد

اٹھیں گے خواب گرانِ عدم سے محشر میں
وہ دن ہے اپنے لیے یا کہ ہے شبِ میلاد

اُٹھے کی حسرتِ مردہ بھی اپنے ساتھ ہی ساتھ
کہ جس طرح سے کسی شخص کا کوئی ہمزاد

اس آسمان کے اس دن اُڑائیں گے پُرزے
دلِ ستم زدہ آخر ملے گی تیری داد

وہی ہم اور وہی وضع جوششِ گریہ
وہی ہم اور وہی طرح شورشِ فریاد

اُٹھیں گے خاک سے ہم اُس کی جستجو کرتے
یہ مشتِ خاک ہوئی جس کی راہ میں برباد

مثنویات

لذتِ فنا

مرزا صاحب کی بہت مختصر مثنوی ہے اس کا سبب تصنیف یہ ہے کہ ایک عرفی شیرازی کا یہ شعر نظر سے گزرا۔

ذوق فنا ینا فتنہ ورنہ در نظر
رنگین تراز بہار بود جلوۂ خزاں

دیر تک محویت رہی اور اسی عالم میں چند شعر قلم اُٹھا کر لکھنا شروع کیے ایک مختصر مثنوی تیار ہو گئی۔ یہ نظم از اوّل تا آخر حکیمانہ خیالات سے لبریز ہے۔ میرے خیال میں علیحدہ یہ نظم کہیں نہیں چھپی اس لیے اس کا زیادہ حصّہ نقل کیے دیتا ہوں

موت کلید در اسرار ہے — موت مسیحائے ہر آزار ہے
معنی امکان تغیر ہے موت — صورت بطلان تحیر ہے موت
موت لاریب مال حیات — علت نمائی و کمال حیات
زندگی صاحب عرفاں ہے موت — راہبر کوچہ جاناں ہے موت
موت سے ڈرتے نہیں اہل کمال — موت سے ڈرنا ہے حماقت پہ دال
مایۂ رحمت ہے پئے اشقیا — آیۂ رحمت ہے پئے اولیا
قید تشخیص سے چھڑاتی ہے یہ — عالم تجرید دکھاتی ہے یہ

بند کشائے قفس تن ہے یہ — سیر نمائے گل و گلشن ہے یہ

زیست ہے اک اسم یہ موسوم ہے — زیست ہے اک لفظ یہ مفہوم ہے

اس سے بنا مطلب رفت و بود — اس سے کھلا رابطۂ ہست و بود

علت و معلوم بقاؤ حیات — حاصل و محصول بقاؤ حیات

شرح کن معنی بیم رجا — درس وہ حکمت فقر و فنا

قاطع شہوات طبیعی ہے یہ — ہادم لذات طبیعی ہے یہ

بادۂ عزت کا یہی ہے خمار — تشنۂ دولت کا یہی ہے اتار

سرد کن آتش ظلم و فتور — زرد کن چہرۂ اہل غرور

مہتمم مجلس شور و شغب — محتسب محفل عیش و طرب

علت کا لوس دماغ علیل — مورث غلیان مزاج علیل

مبطل سر دعوئے باطل ہے یہ — عجز ہے یاں سب کو وہ مشکل ہے یہ

راس خطئیات ہے حب حیات — حکمت و عرفاں ہے خیال ممات

زیست میں ہے تشائبۂ فصل دوست — موت میں ہے ذائقۂ وصل دوست

موت ہے محبوب شہیدان عشق — موت ہے مطلوب مریدان عشق

قلزم ہستی کا کنارا ہے یہ — جیتے ہیں جس پر وہ سہارا ہے فنا

ذات خدائے ازل کے سوا — اور ہر اک شئے کے لئے ہے فنا

داخل ہر خلوت و جلوت ہے یہ — عارض ہر وحدت و کثرت ہے یہ

کون سے جوہر میں نہیں اس کا نور — کون سے عالم میں نہیں اس کا شور

چار عناصر میں اسی کی ہے دھوم — مل کے ہوا میں ہوئے باد سموم

مادۂ خاک سے پیدا ہوئی — زہر کی صورت میں ہویدا ہوئی
آب میں سیلاب کی صورت بنی — [illegible] میں احراق کی علت بنی
مطلع انوار جمالی ہے یہ — مظہر آثار جلالی ہے یہ
جوہر آئینۂ علم و کمال — گوہر گنجینۂ ذکر و خیال
عین عنایات عزیز و علیم — قدرت قہار قدیر و قدیم
مرہم زخم غم دوری ہے یہ — واسطۂ قرب حضوری ہے یہ
زیست حجاب رُخ مطلوب ہے — بند نقاب رُخ محبوب ہے
موت نے کی عقدہ کشائی اگر — شاہد مقصود ہوا جلوہ گر
لوث ہیولیٰ سے مبرا کیا — عار تعین سے معرا کیا
عالم ناسوت سے پائی نجات — ہو گیا حاصل شرف قرب ذات
داخل بزم جبروتی ہوئی — محرم رمز ملکوتی ہوئی
عابد و معبود ہوتے رو برو — شاہد و مشہود ہوئے رو برو
ساجد و مسجود مقابل ہوتے — فانی و موجود مقابل ہوئے
عاقل و معقول ہوتے ایک جا — قابل و مقبول ہوئے ایک جا
عالم و معلوم میں قربت ہوئی — حاکم و محکوم میں قربت ہوئی
باطن و ظاہر کا کھلا مدعا — اول و آخر کا کھلا مدعا
پردہ دوئی کا نہ رہا درمیاں — کھل گئے اسرار نہان و عیاں
قطرہ و دریا میں ہوا اتحاد — سہل ہوئی مشکل عود و معاد
لطف حیات ابدی مل گیا — نقد وصال صمدی مل گیا

روک لے مرزا قلم رُستہ خال | مسلکِ توحید ہے اندیشہ ناک
ظلمت ظلمات سے تاریک ہے | باڑھ سے تلوار کی باریک ہے
پائے خرد لنگ ہے اس راہ میں | جوہر کل دنگ ہے اس راہ میں
برتر از ادراک و خیال بشر | خارج از امکان قیاس و نظر
حرف شکایت کا یہ موقع نہیں | رمز و کنایت کا یہ موقع نہیں
خوب لکھی تو نے ثنائے ممات | دور ہوئی دل سے ہوائے حیات

عالم اجسام ہے ناپائیدار
ہستی موہوم کا کیا اعتبار

مثنوی امیدو بیم

اسابرا تھو برین کالج میں شب کو پڑھانے جاتے تھے، وہاں کسی سے تعلق خاطر ہو گیا اُسی دُھن میں مثنوی اُمید و بیم کہہ ڈالی، اس میں تین جزو ہیں جزو اوّل میں اُن آرزوں کا ذکر ہے جو کبھی پوری نہ ہوں گی کسی کے تصوّر سے رمز و کنائت شکوہ و شکایت کا سلسلہ خواہ مخواہ پیدا کیا گیا ہے جزو دوم میں صنع خدا کی عظمت پر اجمالی نظر پھر انسان کے دل و دماغ کا مختصر بیان ہے، جزو سوم میں طلسمِ اُمید و بیم کی ایک نمائش دکھائی گئی ہے۔

یہ پوری مثنوی سوائے جزو اوّل کے حکیمانہ خیالات سے مملو ہے، اشعار ذیل سے شروع ہوتی ہے۔

مدد اے حوصلۂ عشق و وفا ‏ ‏ مدد اے ولولۂ حسرت و ہوا
مدد اے غلغلۂ جبّہ دری ‏ ‏ مدد اے سلسلۂ بخیہ گری
مدد اے رنج گرفتاریٔ دل ‏ ‏ مدد اے راحت بیکاریٔ دل
مدد اے سوزشِ پنہاں ہوس ‏ ‏ مدد اے شورشِ طوفان ہوس
مدد اے حسرت ناکامیٔ شوق ‏ ‏ مدد اے وسعت بدنامیٔ شوق
مدد اے دوستیٔ تیغ و جگر ‏ ‏ مدد اے دشمنیٔ سعی و اثر
مدد اے لذت افکار محال ‏ ‏ مدد اے تلخیٔ اوقات خیال
مدد اے ہمت دشوار پسند ‏ ‏ مدد اے جرأت آزار پسند
مدد اے نطق پریشاں تقریر ‏ ‏ مدد اے خامۂ ہذیاں تحریر

اس کے بعد چار پانچ صفحوں میں اپنی جوانی کے افسانے بیان کرتے ہیں پھر اپنے عشق کا اظہار کرتے ہیں۔

پھر ہوا عشق دلِ مضطر کو ‏ ‏ دو خبر میرے نصیحت گر کو
ہے ابھی تک وہی آشفتہ سری ‏ ‏ چارہ گر آ کے کریں چارہ گری
کوئی تدبیر نکالیں اب بھی ‏ ‏ وہی زنجیر نکالیں اب بھی
آج تک سر سے وہ سودا نہ گیا ‏ ‏ عشقبازی کا وہ لپکا نہ گیا
راہِ الفت میں مجھے ٹوکیں تو ‏ ‏ لو میں جاتا ہوں مجھے روکیں تو
دھجیاں ڈھونڈھ کے لائے کوئی ‏ ‏ پھر رفوگر کو بلائے کوئی

اس حصہ میں تو شاعری ہے اور اصلیت بہت کم۔ جزو دوم میں مرزا اپنے فلسفیانہ رنگ پر آ گئے ہیں اور وہی حکیمانہ باتیں چھیڑ دیں۔

نفس کی تعریف میں کہتے ہیں

سرِ مکتوم ہے کیفیتِ نفس — کس کو معلوم ہے ماہیتِ نفس
محشرستانِ خیالِ انسان — اک طلسمات ہے حالِ انسان
کبھی ناظر ہے کبھی ہے منظور — کبھی مختار کبھی ہے مجبور
مرکزِ دائرہ بیم و رجا — محورِ دائرہ حرص و ہوا
جمع ہیں اس میں صفاتِ متضاد — ہے مرید آپ ہی اور آپ مراد
کبھی طاعت میں ملک سے بھی ہوا — کبھی رفعت میں فلک سے بھی ہوا
رہروِ منزلِ بدنامیٔ شوق — گمرہِ وادیٔ ناکامیٔ شوق
اپنی کوشش پہ کبھی ناز اسے — ناامیدی سے کبھی ساز اسے
مضمحل کوتے جفا میں نہ کبھی — مستقبل راہ وفا میں نہ کبھی
کبھی آوارۂ میدانِ ہراس — کبھی گمگردۂ غولِ وسواس
کبھی جلوہ ہے کبھی طور ہے یہ — کبھی سایہ ہے کبھی نور ہے یہ
مسکنِ خمکدۂ جوش و خروش — خود فراموش سراسر مدہوش
کبھی دیوانۂ حسنِ تجرید — کبھی مستانۂ جامِ توحید

عالمِ کون و فساد کو ایک حکیمانہ نظر سے دیکھتے ہیں۔

قابلِ غور ہیں اسرارِ وجود — دیکھنا چاہیئے آثارِ شہود
کچھ تو سمجھیں یہ معما کیا ہے — کچھ تو دیکھیں یہ تماشا کیا ہے
ہے یہاں صنعتِ صانع پہ دلیل — آیۃ اللہ ہے یہ بے تاویل
غور سے دیکھ شہودِ اشیا — اک تماشا ہے نمودِ اشیاد

دیکھ تو صنعِ خدا کی عظمت ۔۔۔ حیرت افزا ہے فضا کی عظمت

جس میں لاکھوں متحرک اجسام ۔۔۔ اک وطیرے پہ ہیں گردش میں مدام

راستوں پر وہ نہ اٹکیں نہ تھکیں ۔۔۔ اپنے محور سے کبھی ہٹ نہ سکیں

نہ اُلجھتے ہیں نہ گرتے ہیں وہ ۔۔۔ ایک ہی وضع سے پھرتے ہیں وہ

کیوں گریں دوڑ کے چلتے ہی نہیں ۔۔۔ حد سے باہر وہ نکلتے ہی نہیں

بیضوی شکل کسی کی تدویر ۔۔۔ حرکت جس میں اسے بے تاخیر

تکافی متزائد حرکات ۔۔۔ تقابائی تباعد حالات

حجم میں کوئی زیادہ کوئی کم ۔۔۔ ایک سے ایک کو ہے ربط بہم

اک نئی شان ہے دیکھو جس کو ۔۔۔ کھینچتا ہے یہ اُسے وہ اُس کو

یہ نہ سمجھو کہ ہیں اتنے تارے ۔۔۔ آنکھ سے دیکھے ہیں جتنے تارے

نظر آتے نہیں ہم کو اکثر ۔۔۔ جو کہ ہیں حدِ نظر سے باہر

دیکھ کیا حال ہے سیاروں کا ۔۔۔ عجب انداز ہے رفتاروں کا

گردشوں کے لئے میدان وسیع ۔۔۔ اک تناسب ہے بطی اور سریع

سینکڑوں شمس ہزاروں اقمار ۔۔۔ بلکہ اس سے بھی کہیں بڑھ کے شمار

شمس کے گرد ہیں سائر سیار ۔۔۔ گردِ سیار ہیں دائر اقمار

روشنی میں کوئی کم کوئی سوا ۔۔۔ ایک سے ایک کرے کسبِ ضیا

اس قدر دور ہیں اکثر انجم ۔۔۔ دیکھتے ہی نہیں جن کو ہم تم

بسکہ حیّز ہے بہت دور اُن کا ۔۔۔ راستہ میں ہے ابھی نور ان کا

دور ایسے ہیں وہ اجرام فلک ۔۔۔ روشنی اُن کی نہ پہنچے ہم تک

ان کے اعداد خدا ہی جانے — اُن کی تعداد خدا ہی جانے

ہے فضا جسم اثیری سے بھری — ضو کی اس وجہ سے ہے جلوہ گری

حامل ضو ہے یہی جسم لطیف — یہ ہوا جس کے مقابل ہیں کثیف

دیکھ آنکھوں سے یہ ساماں کیا ہے — دیکھ تو ظاہر و پنہاں کیا ہے

ایک ہی حکم کے سب ہیں طابع — کیونکہ ہے ایک ہی ان کا صانع

اک تماشا ہے یہ چلتی ہوئی کل — عقل نے جس کی نہ پائی اٹکل

پُرزے پُرزے میں بھری ہے قوت — جس سے قائم ہے نظام حرکت

دور کیوں جایئے زمیں کیا کم ہے — بلکہ ہر ذرہ نیا عالم ہے

دیکھو اجرام ذوات الاذناب ا؎ — ان کے میقات اور انکے اسباب

چھوٹے تارے جنہیں کہتے ہیں شہاب — ٹوٹتے رہتے ہیں ہو مثل حباب

راہ میں دور زمیں کے آکر — جب وہ کھاتے ہیں ہوا سے ٹکر

فوراً آ جاتی ہے شامت ان کی — یہی ٹکر ہے قیامت ان کی

اتفاقاً جو کوئی جرم کبیر — جس کے آگے ہو زمیں جرم صغیر

بیچ میں پڑ کے کہیں ٹکر کھاتے — دفعتہً ساری زمیں چکر کھاتے

آتے اس طرح اک آواز مہیب — لوگ جانیں کہ قیامت ہے قریب

پُرزے پُرزے ہو جہاں آباد — ذرہ ذرہ ہو فضا میں برباد

ایک دم میں نہ شجر ہوں نہ حجر — نہ چرندے نہ پرندے نہ بشر

ا؎ دمدار ستارے

کچھ زمیں پر نہیں موقوف یہ بات — نہیں عالم میں کسی شے کو ثبات
کیا تعجب یہ کرہ جب ہو شکست — یا کوئی اور ہی کوکب کو شکست
مرکزِ ثقل سے گر جائے قمر — پھر جہاں میں نظر آئے نہ قمر
شمس پر بھی کوئی آفت آ جائے — سارے عالم میں قیامت آ جائے
ابھی باطل ہو نظامِ شمسی — جائے ظلمت ہو مقامِ شمسی
روشنی ہو نہ حرارت ہو کہیں — زندگی ہو نہ طبیعت ہو کہیں
نہ ہو صورت نہ ہیولیٰ کا پتا — نہ ہو قوت نہ انرجی کا پتا
ہیں یہ اعراض و جواہر کیا چیز — ایک ہی آن میں سب ہوں ناچیز
اس سے ہے ذاتِ خدا بے پروا — کہ ہو اک دم میں جہاں ناپیدا
اس کی مرضی پہ ہے پیدا ہونا — کچھ ضروری[1] نہیں ان کا ہونا
ان گھروندوں کا بنانا بھی ہے سہل — اور پھر اُن کا مٹانا بھی ہے سہل
کیوں بنایا یہ ہمیں کیا معلوم — کیوں مٹایا یہ ہمیں کیا معلوم
اس کی حکمت سے ہے یہ کون و فساد — اس کی تقدیر سے ہے عود و معاد
رمزِ ایجاد کو کیا پہچانیں — بھید کی بات ہے ہم کیا جانیں

نوبہار

مرزا کی تمام مثنویوں میں اس مثنوی کا پایہ باعتبارِ زبان و خیالات بہت

---

[1] کیونکہ یہ سب ممکنات ہیں ضروری صرف ذاتِ واجب الوجود ہے۔

بلند ہے، یہ مثنوی نہایت مختصر اور ابتدائی کلام معلوم ہوتا ہے، زیادہ التفات کے قابل، چند شعر اس کے سن کر اس بات کو ختم کر دیجئے۔

طفل غنچہ کی چمن میں آج بسم اللہ ہے ۔۔۔ جس طرف دیکھو ادھر اللہ ہی اللہ ہے
کہدو ملا سے گلستاں کا سبق ہے اب فضول ۔۔۔ لیگئے مکتب کے لڑکے جھولیاں بھر بھر کے پھول
ابر دریا بار نے گلبین کے تھالے بھر دیتے ۔۔۔ ساقیِ فیاض نے مئے سے پیالے بھر دیتے
باغ میں کالی گھٹا نے آکے چھائی چھاونی ۔۔۔ کھل گئے گلہائے زنگار رنگ پھولی ساونی

سلام

مرزا صاحب کو مرثیہ و سلام کی طرف کوئی خاص توجہ نہ تھی مگر مرزا محمد جعفر صاحب اوجؔ مرحوم کی خاطر سے اکثر سلام کہا کرتے تھے۔ حضرت اوجؔ مرحوم دستور قدیم کے موافق چھبیسویں رجب کو نیا مرثیہ میر باقر سوداگر کے امام باڑہ میں پڑھا کرتے تھے اس موقع پر اکثر مرزا صاحب سے اصرار کر کے سلام کہلواتے تھے اور قبل اپنے مرثیے کے خود پڑھا کرتے تھے۔ مرزا صاحب کے ساتھ میں بھی اکثر ان مجلسوں میں شریک ہوا ہوں جن میں اُن کے سلام پڑھے گئے ہیں، مرزا محمد طاہر صاحب رفیع خلف حضرت اوجؔ مرحوم سے مرزا صاحب کے چند سلام ملے باقی سرمایہ سلام کا بھی ضائع ہو گیا۔ چند اشعار انتخاب کر کے لکھتا ہوں۔

(۱)

شوقِ تسلیم و رضا بے سر و سامان نکلا ۔۔۔ بے کفن فاطمہ کا زینتِ داماں نکلا
اشک کا تار مسلسل ہے نہ کر فکر مآل ۔۔۔ سلسلہ عفو کا اے خجلت عصیاں نکلا

لاش سرور کا نہیں کوئی چھپانے والا
اب تو ارماں ترا اے ریگِ بیاباں نکلا

ہیچ ہو جائے گی خورشید قیامت کی نمود
دل سے میرے جو کوئی داغ نمایاں نکلا

غم کو ہیں کو حسرت نے جگہ دی دل میں
ہم جسے تنگ سمجھتے تھے پریشاں نکلا

ذکر مرزا کے جو نالوں کا ہوا گلشن میں
آشیاں سے نہ کوئی مرغِ خوش الحاں نکلا

(۲)

صورتیں غم کی ہیں یوں تازہ گرفتاروں میں
کوئی دیکھے تو کہے نقش ہے دیواروں میں

اے خوشا گرمیٔ بازارِ جمال اکبرؑ
نام لکھواتے ہیں یوسف بھی خریداروں میں

پاس تھا صنعتِ قدرت کے خزانہ جتنا
ہے وہ سب شبر و شبیر کی سرکاروں میں

گو کہ کمسن تھے بہت حضرت زینب کے پسر
آنکھ جھپکی نہ چمکتی ہوئی تلواروں میں

سر اصغر کو جو دیکھا تو یہ بولا انصاف
کیا یہ بچہ بھی ہے حاکم کے گنہگاروں میں

مشورہ فوج میں ہے لاش کی پامالی کا
نہیں حر پاس کوئی شہ کے طرفداروں میں

(۳)

منزلِ شوق سے تا سرحدِ عرفاں جاتے
کربلا ہوتے ہوئے سوئے خراساں جاتے

بزمِ ماتم بھی نہیں سوزِ الم سے خالی
ہم کہاں جینے کو اے شمع شبستاں جاتے

دل بھی ہے درد بھی ہے سر بھی ہے سودا بھی ہے
عرصۂ حشر میں کیوں بے سر و ساماں جاتے

لاش اکبر پہ یہ کہتی تھی جوانی رو کر
ایسے دیکھے نہیں دنیا سے پُر ارماں جاتے

ہے وہ درگاہِ حسینی کہ بشرطِ اقبال
دن میں سو بار گدائی کو سلیماں جاتے

منزلِ شوق میں جو پاؤں ہوئے گرد آلود
کیوں پئے زینت اورنگِ سلیماں جاتے

تاجِ شاہی کو مبارک رہے رفعت اپنی
خاک ہو کر بھی نہ ہم تا سرِ خاقاں جاتے

آرزو تھی کہ ہم اِس راہ میں ترتا بقدم اپنے سایہ کی طرح خاک پہ غلطاں جاتے
قسم حضرتِ عباس کہ اُس وادی سے ہو کے پیاسے نہ سوئے چشمۂ حیواں جاتے
قتل میں سبطِ پیغمبر کے جو ہوتے نہ شریک کس بہانے سے جہنم میں مسلماں جاتے
کربلا جاتے تو اس شان سے جاتے مرزاؔ خستہ دل خاک بسر چاک گریباں جاتے

مرزا صاحب کا اس قدر کلام بہت دقت سے دستیاب ہوا ہے معیار
حدنگ نظر۔ پیامِ یار لکھنؤ کے پُرانے رسالے امراؤ جان وغیرہ سے بعض اشعار
نقل کئے گئے اور اس کا افسوس رہا کہ اُن کُلیات برباد ہو گیا۔

مرزا کی جیسی قدر چاہیئے نہیں ہوئی بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اونھوں نے خو
نہیں کی۔ موجُودہ زمانہ اس رنگ کا ہے کہ ارباب کمال جب تک اپنی شہرت
کے اسباب نہ پیدا کریں لوگ پہچانتے ہی نہیں مرزا صاحب فطرۃً اس بات سے
محروم تھے۔

مرزا صاحب کے اُن تلامذہ کا شمار ہی نہیں ہو سکتا جنہوں نے کالجوں میں
اُن سے پڑھا۔ گھر پر آنے والے اصحاب بھی بہت کثرت سے تھے جن میں بعض
مشہور ادیب اُون کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہیں۔ راقم الحروف نے بھی اکثر افادات
حاصل کئے مگر مرزا صاحب کی ذات اس سے مستغنی تھی کہ وہ اپنا شاگرد کسی کو بتا کر
اور اس پر فخر و مباہات کریں وہ ہمیشہ سب سے دوستانہ حیثیت سے ملتے تھے

مرزا رسوا کی نثر

مرزا صاحب کا پہلا نقش ادبی افشائے راز ہے جس میں انہوں نے اپنی آپ بیتی لکھی ہے اس کے بعد شریف زادہ، امراؤ جان ادا، ان کتابوں نے خاص مقبولیت حاصل کی۔

مولانا عبدالماجد صاحب کے سحر نگار قلم نے ہندوستانی میں مرزا صاحب کے ناولوں پر ایک تبصرہ کیا ہے اور بہترین اقتباسات پیش کئے ہیں، اب ضرورت نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے خصوصاً امراؤ جان کی سرگزشت کا آخری حصہ جو مولانا نے نقل کیا ہے میں نے پڑھا بے اختیار آنکھوں سے آنسو گر پڑے، مرزا نے دو ایک افسانے ابتدا میں اپنے شوق سے لکھے باقی کتب فروشوں کے اصرار سے مجبور ہو کر۔

مرزا صاحب اکثر مفلس رہا کرتے تھے، امین آباد اور چوک کے کتب فروش اکثر گھیرے رہتے اس زمانے میں ناولوں کا بازار گرم تھا۔ عام طبیعتیں راغب تھیں کبھی کبھی معقول رقمیں پیشگی دے دیا کرتے تھے، منت خوشامد کی کوئی حد نہ تھی اس طرح مرزا قلم برداشتہ ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ میں کچھ لکھ کر دے دیا کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کے اوقات میں میں نے دیکھا ہے کہ ان کا قلم بغیر تفکر کے نہایت روانی سے چلتا تھا۔ یہ تو افسانے ہیں، علمی موضوعات پر انہوں نے جو کچھ لکھا

ہے وہ کارنامے ہیں، رسالہ اشراق ورسالہ حکیم دیکھنے والے مرزا کے علم وفضل اور اُن کی قوت تحریر کا اندازہ کر سکتے ہیں:

رسالہ معیار جب پہلے پہل شائع ہوا تو اس کے دور اوّل میں مرزا صاحب کے مضامین مسلسل ہوتے تھے اس وقت رسالہ کی اشاعت بہت تھی، اور زمانہ بھی ہو گیا لہٰذا اُن کے بعض مضامین کو جو فلسفۂ شعر کے متعلق ہیں، ناظرین زمانہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، یہ مضامین مراسلہ کی شکل میں معیار کے مختلف نمبروں میں شائع ہوتے تھے۔

مراسلۂ مرزا رسوا مرحوم نمبر ا

میرے اس خط اور دوسرے خطوں کا جو اس کے بعد لکھے جائیں گے، یہ منشا ہوگا کہ علم شعر کی اُن خوبیوں کو جنہیں اُردو زبان کی شاعری ڈھونڈھ رہی ہے حتی الوسع بیان کر دوں، مگر سخت مشکل یہ ہے کہ ان اُمور کو سمجھنے کے لئے جن کو میں ذکر کیا چاہتا ہوں مُبادی اور مسائل علم نفس سے واقف ہونا بہت ضروری ہے اور اس علم کی کوئی کتاب بالفعل زبان اُردو میں نہیں ہے۔ شیخ ابوعلی سینا کا ایک رسالہ زبان فارسی میں میرے پاس تھا اور اس کا ترجمہ بھی میں نے اُردو زبان میں لکھا تھا اور تحقیقات جدیدہ کے موافق بعضے حواشی اور تعلیقات اُس پر زیادہ کر دیئے تھے، وہ گم ہو گیا۔ شیخ کی کتاب شفا جملہ طبیعیات میں بھی اس علم کا بیان موافق تحقیقات قدیم کے ہے مگر وہ عام نظروں سے دور ہے۔ میں نے ایک رسالہ خاص اس علم میں تصنیف کیا ہے مگر وہ چھپا نہیں اور اگر چھپے بھی تو اصطلاحات علمی

کی فہم سے اکثر اذہان قاصر ہیں اس لئے وہ بھی اس مطلب کے لئے مفید نہیں۔

امور مذکورہ بالا پر نظر کر کے یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اولاً ایک مختصر اور عام فہم طریقہ سے علم نفس کے بعض اصولوں کا ذکر کردوں جس سے ان مطالب کے سمجھنے میں سہولت ہو جنہیں میں بیان کیا چاہتا ہوں۔ دنیا میں جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں جب ہم اُن کی صفتوں کو جُدا جُدا کر کے ہر ایک پر غور کریں تو ایسا معلوم ہوگا کہ کسی نہ کسی حاسّہ کے ذریعہ شعور حاصل ہوا ہے۔ مثلاً گلاب کے پھول کا رنگ اور شکل خاص بذریعہ حاسہ بصر کے اور خوشبو شامہ سے اور وزن کا ہلکا پن ہاتھ پر رکھ کر کے اندازہ کرنے سے معلوم ہوا ہے۔ ایسی چیزوں کو جو بذریعہ کسی حاسہ کے معلوم ہوں محسوس کہتے ہیں۔ ذہن کے اس فعل کو جس سے محسوس کا علم ہوا ہے احساس کہتے ہیں۔ احساس کی تعریف یہ ہوئی احساس مراد ہے اس اثر کے شعور سے جو کہ نظام آلی پر کسی موثر کی تاثیر سے حادث ہوتا ہے۔ مثلاً روشنی کے ذریعہ سے جو آنکھ پر اثر ہوتا ہے اس سے مبصرات کا شعور ہوتا ہے یا ہوا کے تموج اور تصادم سے کان پر جو اثر ہوتا ہے اس سے مسموعات کا۔ اور بودار جسموں کے اجزائے لطیف جو ہوا میں مل کر شامہ تک پہنچتے ہیں، ان مشمومات کا اور پانی میں حل ہو جانے والے جسموں سے ذائقہ پر جو اثر ہوتا ہے اس سے مذوقات اور اجسام کے چھونے سے اُن کی نرمی یا سختی اور گرمی یا سردی کا جو شعور ہوتا ہے انہیں ملموسات کہتے ہیں اجسام کی مزاحمت اور وزن کا علم بذریعہ عضلات کے ہوتا ہے حرکت کا شعور بھی عضلات اور دوسرے حواسوں کی شرکت سے ہوتا ہے۔

احساس کی شرط یہ ہے کہ شئے محسوس اس آلہ جسم سے متصل ہو جس سے

اس کا تعلق ہے مثلاً جب تک گلاب کے پھول سے روشنی کی شعاعیں آنکھ پر نہ پڑیں گی اُس رنگ اور شکل کا شعور نہیں ہو سکتا یا جب تک اس کی خوشبو کے اجزائے لطیف ہوا میں مل کر مشام تک نہ پہنچیں اُس کی خوشبو نہ معلوم ہو گی یا جب تک ہم اس کو نہ چھوئیں اس کی نرمی کا حال ہم پر نہ کھُلے گا۔ خلاصہ یہ کہ احساس کے لئے شئے محسوس کا ہونا شرط ہے۔

مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ شئے کی ایک ہی صفت کا ہمیں احساس ہوتا ہے اور سب صفتیں ہم کو یاد آجاتی ہیں اگرچہ بالفعل وہ غائب ہوں مثلاً گلاب کے پھول کی خوشبو سے ہم کو اس کی رنگت اور شکل یاد آجاتی ہے یا مثلاً ایک قسم کے عطر کی خوشبو ہم نے پہلے کبھی سونگھی تھی اب ایک مدت کے بعد جب ویسی ہی خوشبو ہماری ناک میں آئی تو ہم کو فوراً یاد آجاتا ہے کہ یہ اس عطر کی خوشبو ہے دونوں مثالوں سے واضح ہو گا کہ شئے حاضر نے شئے غائب کو یاد دلایا۔

ان صورتوں سے حکما نے دو قانون اخذ کئے ہیں ان کو لزوم ذہنی کے قانون کہتے ہیں۔

اول :- قانون مماثلت :- دو یا زیادہ چیزیں ایک دوسرے کے مثل جب مختلف وقتوں میں ملاحظہ ہوں گی تو ایک دوسرے کو یاد دلادیں گی۔

دوم :- تباین، یہ چیز مثل اُس چیز کے نہیں ہے۔

ہر ایک احساس کی تین حیثیتیں ہوتی ہیں۔

۱۔ شعور محض

۲۔ اُس احساس سے خاص لذت یا الم کا حاصل ہونا۔

۲- وہ احساس کسی خاص تحریک کا باعث ہو۔

مثلاً گلاب کے پھول کو دیکھنے سے ایک تو یہ علم ہوا کہ اس کا رنگ ایسا شکل ایسی اور خوشبو ایسی ہے، یہ شعور محض ہے دوسری یہ کہ گلاب کا رنگ اور شکل کے دیکھنے سے یا خوشبو کے سونگھنے سے ہم کو مسرت یعنی لذت حاصل ہوئی یا مثلاً اُس کا کانٹا چبھ جانے سے ہم کو الم ہوا یا وہ لذت اس حد تک پہنچی کہ گلاب کے پھول کو توڑنے کا ہمیں شوق ہوا۔ چنانچہ اس کو توڑنے کا قصد کر کے ہم نے اُسے توڑ لیا اور کانٹے کے چبھ جانے سے جو الم ہوا تھا اس لئے اُس سے بچتے رہے۔

حکماء نے ان میں سے ہر ایک کا ایک جُداگانہ نام رکھا ہے اوّل کو شعور دوسرے کو وجدان تیسرے کو ارادہ کہتے ہیں۔

شعور کے کئی درجے قائم کئے ہیں جن کا ظہور انسان کے رُشد اور بلُوغ تک ہو جاتا ہے کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔

پہلے درجہ کا نام ادراک ہے یعنی کسی چیز کے مجموعہ صفات کے احساسات سے اُس چیز کو شناخت کرنا دوسرے تعمیم یعنی چیزوں میں عموم اور خصوص کی نسبتوں کا قائم کرنا صنف اور نوع اور جنس کا قرار دینا۔ مثلاً ایک خاص طرح کی شکل اور رنگ اور خوشبو کے اعتبار سے گلاب ایک نام رکھ لیا۔ ایسی بہت سی چیزیں ہیں کہ اگرچہ اُن کی رنگت اور شکلوں میں اختلاف ہے مگر بعض اوضاع خاص کی وجہ سے ملتے جلتے ہوئے ہیں اس لئے ان کو پھول کہتے ہیں:۔

تیسرے استدلال:۔ جزئیات سے کلی اور کلیات سے جزئی پر خاص حکم لگانا مثلاً زید فانی ہے، عمر فانی، خالد فانی ہے، لہٰذا انسان فانی ہے یا مثلاً کل

انسان فانی ہیں زید انسان ہے لہذا زید فانی ہے۔ پہلی صورت کو استقرا اور دوسری کو قیاس کہتے ہیں۔

چوتھے تمثیل، ایک قسم کے مجموع صفات کو ذہناً ایک شخص یا فرد میں تجویز کر لینا۔

یہ چار طبیعی درجے ذہن انسان کی ترقی کے ہیں، ان کے علاوہ توہمات، خواب، مشی النوم اور جنون یہ حالتیں غیر طبیعی ہیں۔

تمثیل کے معنی لغت میں نگاشتن پیکر کے ہیں، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ جو صورتیں کبھی عندالذہن حاضر تھیں ان کو پھر ذہن کے سامنے لانا۔ دوسری نئی صورتیں جو عالم خارجی میں موجود ہی نہ ہوں اُن کو ایجاد کرنا۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہو گا کہ تمثیل خواہ مخواہ ایک جدید اصطلاح ایجاد کی گئی ہے حقیقتاً یہ وہی ہے جس کو تخییل کہتے ہیں، اور محاکات اور اختراع اس کی دو قسمیں ہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ تخییل ایک شرط ذہن کی ہے جس کا بروز ابتدائے نشو و نما سے ہوتا ہے، اور جس پر دو دو قانون تذکر اور تقابل کے قائم کئے گئے ہیں جن کا ذکر سابقاً ہو چکا ہے۔ اور تمثیل کا ظہور ترقی ذہنی کا آخری درجہ ہے جس سے اکثر اذہان بہت ہی کم بہرہ یاب ہوتے ہیں۔

اگر تمثیل کے اور اُس کی دونوں قسموں کے ساتھ ساتھ لفظ شاعرانہ زیادہ کر کے ہم شاعرانہ تمثیل اور شاعرانہ محاکات اور شاعرانہ اختراع کہیں تو ہمارے مطلب کے لئے مفید ہو سکتا ہے محاکات وہ حالت ذہن کی ہے جبکہ وہ چیزیں جو کبھی عندالذہن حاضر تھیں اُن کی صورتیں جو خزانہ حفظ میں موجود ہیں پھر

ذہن کے سامنے آجائیں اُس کو استرجاع کہتے ہیں اس کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ غیرارادی

۲۔ ارادی اور باعتبار ان کے مدت تک ذہن میں حاضر رہنے کے استحضار کہتے ہیں اور یہ بھی یا آزادی ہے یا غیرارادی شاعرانہ محاکات کے لئے انتخاب کا سلیقہ ہونا چاہیئے تاکہ جب الفاظ کے ذریعہ اُن کا بیان کیا جائے تو وہ عندالسامع مقبول ہو یا موجب کسی قبض و بسط کا ہو۔

قبض ایک حالت وجدانی ہے مشابہ الم کے جو مضرات سے اجتناب یا اُن کے دفع کرنے کی آمادگی ذہن میں پیدا کرتی ہے۔

بسط ایک حالت مشابہ لذت کی ہے جو لذت سے متمتع ہونے کے شوق کے باعث ہوتی ہے۔ محاکات محض واقعہ نویس یا مورخ کے لئے زیادہ مفید ہے نہ کہ شاعر کے لئے، اختراع صرف شاعر کا حصہ ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بُت تراش، مصور، طراح بھی شاعر کے شریک فی الصناعت ہیں مگر ان کا ذکر ہمارے مقصود کے لئے مفید نہیں۔ اس لئے ہم نے اُن سے زیادہ تعرض نہ کیا باعتبار حیثیات احساس کے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے تمثیل کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ وہ جن کا تعلق شعور سے ہے (۲) جن کا تعلق وجدان سے ہے (۳) جن کا تعلق ارادہ سے ہے اور جب اُن کے اجتماع کو عقل ایک فرد واحد میں تجویز کرتی ہے تو اُس سے ایک مثالیہ کا ظہور ہوتا ہے جسے کمال کہتے ہیں۔

وہ ذات مقدس جس میں یہ صفات کمالیہ پائے جاتے ہیں، حق اُلحق

جمیل لذاتہٖ، خیر مطلق اور غایت الغایات ہے، ایاہ نعبد وایاہ نستعین، متالیہ اول یعنی حق موضوع فلسفتہ الوجود کا ہے۔ جمال موضوع علم ذوقیات کا ہے، خیر موضوع علم اخلاق کا ہے۔ اور تصور باری تعالیٰ عز اسمہٗ موضوع الٰہیات کا ہے حقیقت نفس الامری سے وہ مراد ہے۔ جس کی موجودگی کو عقل خارج میں تجویز کرتی ہے نہ صرف ذہن میں بخلاف امر ذہنی کے جس کا وجود صرف ذہن میں ہے خارج میں نہیں ہے۔ فافہم۔

جمیل[1] سے مرغوب لذاتہٖ مقصود ہے نہ وہ جس کو ہم کسی غرض سے دوست رکھیں جس کے حصول کا وہ واسطہ ٹھہرے بلکہ اُسی کا حصول عین مراد ہو۔

ممکن ہے کہ امر جمیل نافع بھی ہو یعنی کسی غرض ادنیٰ یا اعلیٰ سے اس کا حصول مطلوب ہو مگر جس حیثیت سے کہ وہ واسطہ کسی غرض کا ہے اُس حد میں داخل نہیں مرغوب الذاتہ کی ایک بہت عمدہ مثال بچوں کے کھیل سے مل سکتی ہے اس لئے کہ اُس سے اُن کی کوئی غرض تشخصی نوعی نہیں ہوا کرتی۔ یہی کھیل کا شوق جو بچوں میں پایا جاتا ہے۔ ترقی کرتے کرتے اس حد تک پہنچ گیا ہے جس سے بت تراشی، مصوری، طراحی موسیقی شعر ایسے ایسے فنونِ لطیفہ نکل آئے ہیں۔ بچوں کے کھیل اور کھلونے بہت سادہ اور سیدھے ہوتے ہیں اور بوڑھوں نے اپنے کھیلوں میں طرح طرح کی پیچیدگیاں اور لطافتیں پیدا کرلی ہیں۔ چشم حقیقت بیں کے نزدیک اصل دونوں کی ایک ہے وہ امر جسے غرض یا اس کی متقارب لفظ نفع سے تعبیر

---

[1] غرض ادنیٰ جس سے بقاء تشخصی مقصود ہے، غرض اعلیٰ جو بقائے نوع کے لئے مفید ہو۔

کرلے دونوں میں نہیں ہے۔ فنونِ لطیفہ کے مقابل وہ فنون ہیں جن کو فنونِ نافعہ کہنا چاہیئے۔ مثلاً فن میکانات (کلیں بنانے کا فن) کے ذریعہ سے وہ چیزیں بنائی گئی ہیں جو انسان کی بقا اور ترقی شخصی اور نوعی کے لیئے مفید ہیں۔

کبھی ایسا ہوا ہے کہ جمال اور نفع دونوں صفتیں ایک ہی شے میں جمع ہو جاتی ہیں مثلاً ایک خوبصورت جیبی گھڑی، ایسی چیزیں عندالذوق و نیز عندالعقل مستحسن ہیں۔

ہر صاحب فن کی غرض یہ ہونا چاہیئے کہ اس کے ایجاد میں دونوں صفتیں پائی جائیں مگر ایسا نہ ہو کہ ایک کی اعانت سے دوسرا ناقص رہ جائے ہر ایک صاحب فن کو اپنے خاص فن کی مراعات لازم ہے اگر اس سے دوسرا مطلب بھی نکل آئے تو فہو المراد۔ مثلاً شاعر کا مقصود یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا شعر اصول سے درست ہو اس میں کوئی ذاتی خوبی ہو۔ پھر اگر اس سے کوئی نصیحت بھی نکلتی ہے تو سبحان اللہ۔ ورنہ نصیحت گری کو ناصح مشفق کے حوالے کرے اور خود بزم شعرا میں اپنی عزت بچانے کے لئے عمدہ شعر کہے

تقسیم فنون کی باعتبار اس آلہ اور مادہ کے جو اُن میں استعمال کئے جاتے ہیں یہ ہے :۔

فنون لطیفہ میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعلق حسِ بصر سے ہے۔

۱۔ بت تراشی (۲) طراحی (۳) مصوری، ان فنون میں شکل اور رنگ سے کام لیا جاتا ہے۔

۲۔ وہ فن جس کا تعلق حسِ سمع سے ہے۔ موسیقی ہے۔ اس میں لحن و

القبائح سے کام لیتے ہیں،

(۳) فنون ادبیہ کا تعلق تخیل سے ہے اور اس میں بذریعہ الفاظ کے کام لیتے ہیں۔ فنون ادبیہ کے لئے لفظ شعر بہت ہی مناسب ہوتا۔ مگر ازبسکہ اس کو کلام منظوم کے لئے بولتے ہیں لہذا خوف التباس سے ترک کیا۔

شعر کا اصل مقصود صرف یہ ہے کہ بذریعہ الفاظ کے شعور و جدان متاثر ہو کر موجب قبض و بسط کے ہوں۔

لیکن فنون ادبیہ میں ضمناً اور اغراض عمدہ بھی شامل ہیں۔ مثلاً حکایت توجیہ، استدلال موعظت اس صورت میں چاہیئے کہ مصنف ترتیب مقدمات میں ایسی لیاقت اور سلیقہ کو صرف کرے جس سے اس کی تصنیف ان دونوں غرضوں کے لئے بدرجہ اتم و اکمل مفید ہو۔ اگر کوئی مورخ کسی واقعہ تاریخی کو اس طرح بیان کرے جس سے سامع یا ناظر کی تخیل میں ہو بہو تصویریں کھنچ جائیں یا کوئی حکیم کسی قانون فطرت کی توجیہ اس صورت سے کرے کہ ہر جزئی میں ہم کو اس کے آثار نظر آجائیں تو کہا جائیگا کہ وہ بیان اور توجیہ دونوں غرضوں (یعنی غرض علمی اور غرض شعری) کے لئے بدرجہ اتم و اکمل مفید ہے وہ علم جو بہت ہی خشک خیال کئے جاتے ہیں مثلاً ریاضی یا منطق اُن کے بیان میں بھی اگر سلیقہ شعری سے کام لیں تو سامع اور ناظر اس سے محفوظ ہو سکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ غرض علمی بھی بخوبی حاصل ہوتی ہے۔ بلکہ اس میں ایک قسم کی مدد ملتی ہے۔

علوم ادبیہ میں بہ نسبت اور فنون لطیفہ کے وسعت بہت زیادہ ہے

اس لئے کہ اس میں سے ہر ایک ایک ہی حاسہ کے موضوع کے استعمال کے لئے محدود ہے۔ رنگ، شکل، آواز۔ فنون ادبیہ جملہ احساسات بلکہ جمیع وجدانیات اور عقلیات کے استعمال پر بشرطیکہ وہ بذریعہ لفظ و عبارت کے ادا ہو سکیں قادر ہیں۔ اگرچہ ادیب کسی مصور کی طرح کسی چیز کی رنگت اور شکل آنکھ سے نہیں دکھا سکتا نہ خوش آیند سُر کانوں تک پہنچا سکتا ہے۔ لیکن وہ الفاظ کے ذریعہ ہر چیز کی صورت صفحۂ تخیل پر کھینچ سکتا ہے نہ صرف ایک رُخ سے بلکہ مختلف رخوں سے یہ ذہنی تصویر بہ نسبت جسمانی تصویر کے زیادہ پائیدار ہے۔ الفاظ کے انتخاب اور تالیف سے نہ صرف نظم بلکہ نثر میں بھی اصول موسیقی کا مزہ پیدا کر سکتا ہے اور لطف یہ کہ ایسی حالت میں کسی اشکال تاریخی یا مسئلہ حکمی کا ثبوت اور حل بھی دیتا جائے گا جو اس کی غرض خاص ہے۔

اگرچہ شاعر بھی واقعات کی ہو بہو تصویریں کھینچنے میں محاکات سے بہت کام لیتا ہے لیکن اس کے حسن کا تعلق خاص اختراع سے ہے بخلاف مورخ کے جس کا تعلق محاکات سے ہے۔ جب شاعر محاکات سے کام لیتا ہے اُس وقت بھی اختراع سے باز نہیں رہتا۔ اس لئے کہ شاعر کی نظر اکثر مرغوب لذاتہٖ اور جمیل کی طرف رہتی ہے لہذا اس کو انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جب اُسے کسی واقعہ کی تفصیل بیان کرنا ہے تو وہ عدالت کے گواہوں کی طرح ہر جزئی ذکر کا پابند نہ رہے گا بلکہ صرف ان امور کو انتخاب کرے گا جو اس کے مطلب کے لئے مفید ہوں، اس صورت میں مکروہات کے ذکر سے قطعاً پرہیز کرے گا اور دوسرے ایسے امور کو بھی ترک کر دے گا جن کو وہ غیر مفید یا مُضر خیال کرتا ہے

مکروہات سے وہ امور مراد ہیں جن کا ذکر بسط و قبض دونوں کے لئے مفید نہیں، اس میں شک نہیں کہ ایسے امور موجب ایک طرح کے انقباض کے ہوتے ہیں۔ مگر شدت انقباض کی وجہ سے قوت توجہ اُن کی طرف اس قدر مبذول ہو جاتی ہے کہ اور امور سے متاثر ہونے کے قابل نہیں رہتی۔ اس صورت میں بیجا صرف قوت کا ہوتا ہے اور اگر اس امر میں کوئی اور خوبی خلقی یا ذوقی نہیں ہوتی تو گویا مفت تضیع اوقات ہے۔

ہم اس موقع پر ایک بہت ہی سہل قانون امور مکروہ سے احتراز کرنے کے لئے تحریر کئے دیتے ہیں اگر اُسے یاد رکھیں گے تو شعر اپنے مقصود میں عمدہ ہوگا وہ قانون یہ ہے۔ ہر ایک شعر کے ماحصل پر غور کر کے دریافت کریں کہ اس سے کس قسم کی تصویر ذہن میں پیدا ہوتی ہے اگر اس تصویر کے اجزا یا لزوماتِ قریبہ میں کوئی امر مکروہ شامل ہے تو اس کو نظری کر دینا چاہیئے۔ ہم اس مقصود کو ذوق کے ایک شعر سے سمجھائے دیتے ہیں ؎

واہ رے شور محبت خوب ہی چھڑکا نمک
استخواں میرے کے ہما کس کس مزے سے کھاتے ہے

اس شعر کو بطور مذکور ملاحظہ کرنے سے ایک تصویر ذہنی ایسی پیدا ہوتی ہے جس میں ایک امر مکروہ شامل ہے یعنی انسان کی ہڈیوں کا نمکین ہونا اور ایک جانور کا اُسے کھانا۔ عمدہ تخیل نہیں ہے یا کسی اور شاعر کا بہت ہی مشہور مطلع اور شاید اکثر صاحبوں کو پسند بھی ہے ؎

شغل اگر چاہتے ہو جی کے بہلنے کیلئے
دل میں آ بیٹھو کلیجہ مرا ملنے کے لئے

اس کے ماحصل میں ایک تصویر ذہن میں بنتی ہے جو بعید از قیاس مضحک اور مکروہ ہے دل میں ایک شخص کا آ بیٹھنا اور ہاتھ بڑھا کر کلیجہ کو ملنا ایک مہمل سی بات ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس شعر میں مخاطب معشوق مجازی ہے معشوق حقیقی اس سے منزہ ہے کہ کسی کے دل میں بیٹھ کر اس کے کلیجے کو ملے

یا غالب کا ایک شعر فارسی کا

داغم ز سوزِ دل نہ خجل دارم ز خلق
بوئے کہ تن ز سوختن استخواں دہد

ہڈیوں کے جلنے سے چرائندہ کا پیدا ہونا جو شاعر کو خلق سے خجل رکھتا ہے۔ واقعی ایک مکروہ امر ہے۔ اور اسی مضمون کو غالب نے اُردو میں بھی کہا ہے۔

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

داغ دل کی بو میں چرائندھ ضرور ہوگی، صرف داغ دل کا ذکر کیا کم تھا کہ اس کے جلنے اور اس میں سے بُو کے پیدا ہونے کا بیان مشرح کیا گیا ہے اور اس موقع پر بو کا استعمال اُسی امر مکروہ پر دلالت واضح ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ امور صرف مجازاً کہے گئے ہیں اس کی اصلیت کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ مجاز کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ حقیقت اس کے ذریعہ سے ذہن نشین ہو کیونکہ مجاز میں اکثر امور عقلی کو محسوسات کے ذریعہ سے جو اقرب الی الفہم ہیں بیان کرتے ہیں مثلاً علم کو جو ایک امر عقلی ہے شمع کہنا وغیرہ اگرچہ وہ مجازات جو اشعار مرقومہ بالا میں شامل ہیں اپنی حد میں درست ہیں، لیکن ان کی تخییل مکروہ ہے جس سے اس کا لطف معدوم ہو جاتا ہے اگر کہا جائے کہ اس قسم کے بے شمار شعر

متقدمیں اور متاخرین کے کلام میں پائے جاتے ہیں تو اُس کا جواب یہ ہے کہ اکثر اسی طرح اغلاط لفظی بھی ان کے کلام میں پائے جاتے از بسکہ زمانہ دراز سے مشرقی شاعری کو درستی الفاظ کا لحاظ رہا ہے لہذا معنویت کی باریکیوں کی طرف غور کرنے کی فرصت نہیں ملی۔

شعر پر نظر کرنے کے دو رُخ ہیں ایک آزادی لفظ دوسرے آزادی معنی۔ جس زمانے میں الفاظ کی باریکیوں کی طرف زیادہ نظر کی جاتی ہے۔ توجہ اسی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ معنویت کا خیال جاتا رہتا ہے اور جب معنویت کا خیال پیدا ہوتا ہے تو لفظی باریکیاں ترک ہو جاتی ہیں۔ ان دونوں میں نسبت عکسی ہے۔ ایک کی افراط دوسرے کی تغر نظیر کا موجب ہو جاتی ہے۔ اکثر ایسے شاعر جو مضمون عمدہ کہتے ہیں اُن کے الفاظ میں وہ سلاست اور نزاکت نہیں ہوتی جو ان شاعروں کے کلام میں ہوتی ہے جن کو مضمون کی جدت اور ندرت کا چنداں لحاظ نہیں ہوتا وہ صرف لطف زبان کے دلدادہ ہیں اور یہ بھی ایک امر قابل لحاظ تھا کہ جو شاعر خلاق مضمون ہیں ان کو طرز ادائے مقصود میں بڑی دقت پڑتی ہے۔ اس لئے کہ ہر ایک جدید خیال کے لئے جدید لفظ چاہیے اُن کو زبان مروجہ میں تصرفات کرنا ہوتے ہیں اور اس صورت میں اُن کا کلام موافق روزمرہ عوام کے نہیں رہ سکتا۔ لہذا اکثر اشخاص جن کی نظریں سطحی ہیں اُن کو ایک قسم کی اجنبیت معلوم ہوتی ہے۔

شکسپیئر شاعر جس کو سعدی انگلستان کہنا چاہیئے اُس کے کلام میں اکیس ہزار الفاظ استعمال ہوئے اور ملٹن نے ساٹھ ہزار لفظیں استعمال کی ہیں، اہل

صناعت کا یہ خیال ہے کہ شیکسپیئر کا دائرہ خیال بہ نسبت ملٹن کے سہ چند تھا ہمارے ہندوستان میں میر کی سلاست مشہور ہے مگر پہلے دیوان کی پہلی غزل میں فرماتے ہیں سے

ہنگامہ گرم کن جو دل ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالہ سے شور نشور تھا

ذرا "ہنگامہ گرم کن" کو دیکھئے اور اُردو زبان کو مگر کرتے کیا اس مضمون کو اور کسی طرح ادا کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

مگر ہاں اتنا کر سکتے ہیں کہ غزل میں زیادہ تر سلاست ہی مناسب ہے اس لئے کہ اس کا موضوع سنجیدہ نہیں ہوتا قصیدہ اور مرثیہ وغیرہ میں خیالات اور اُن کے ساتھ ہی زبان کو وسعت دینا چاہیئے۔

علم طب کا ایک مسئلہ ہے اعتدال حقیقی کا وجود خارج میں محال ہے وہی امر یہاں بھی صادق آتا ہے۔

وزن اور قافیہ کی پابندی شاعری کے لئے کم نہ تھی کہ اُس پر ردیف بڑھائی گئی پھر اور لفظی جھگڑے نکالے گئے۔ بے چارہ جدید مضمون کہاں سے پیدا کرے لفظی جھگڑوں کے بڑھانے سے مضامین کا دائرہ تنگ ہو جائے گا ہندوستان میں سو برس اُدھر کی شاعری آج کل کی شاعری سے اچھی تھی متوسطین نے جھگڑے حد سے زیادہ بڑھائیے اس لیے مزا جاتا رہا۔ مگر اس زمانے میں پھر رجوع معنویت کی طرف ہے اس لئے مجھ کو ان مراسلات کے لکھنے کی جرأت ہوئی۔ ان مراسلات میں بعض امور ایسے پائے جائیں گے جن سے معاصرین با ملا ہیں اور اس سے ممکن

ہے کہ بعض صاحبوں کو تعریض کا موقع ہاتھ آئے۔

مثلاً اس مراسلہ میں مسلم الثبوت استادوں کے بعض شعر جو نظری کر دیتے گئے ہیں ممکن ہے کہ بعض طبیعتوں پر گراں گزرے لیکن یہ اوچھی بات ہے چاہئے کہ معترض کلام کی طرف رجوع کریں اور اصل مطلب کو سمجھیں جو زیادہ تر مفید اور مستحسن ہے ان لفظوں پر میں اپنے مراسلہ کو ختم کرتا ہوں۔ آئندہ اِن اُمور کو تفصیل کے ساتھ ذکر کروں گا جس سے میدان شاعری کا ہنگ اور تاریک ہو جاتا ہے اور اس کے وسعت کے اسباب بھی عرض کروں گا۔

مراسلہ نمبر ۲

اگلے زمانے میں شاعری کی مدح و ذم میں بہت کچھ افراط و تفریط کی گئی ہے مدح کی انتہا تو یہ ہے کہ یہ مصرعہ مشہور ہے

"شاعری جزویست از پیغمبری"

اور ذم میں مثلاً ے

در شعر مپیچ و در فنِ اُو | چوں اکذب اوست احسن او

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ شعر اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی۔ میں اور حیثیات سے قطع نظر کر کے صرف یہ کہتا ہوں کہ بعض اشعار اخلاق کے لئے مفید ہیں اور بعض مضر۔ مثلاً وہ اشعار جن میں اخلاقی مضامین ہوں وہ قسم حسن میں داخل ہیں اور جن میں نفس پرستی کے مضامین ہوں وہ قبیح ہیں، لیکن ہمارے اور ہمارے معاصرین کے بعض اشعار (بلکہ ہمارے اکثر اشعار) ان دونوں صفتوں سے معرا ہیں نہ اُن میں

کوئی حسن ہے نہ قبیح لہٰذا ایسے شعر نہ اُس مدح کے لائق ہیں اور نہ ذم کے ایسے شعر کہنا ایک فعل عبث ہے۔ مصرعہ

شاعری جزو یست از پیغمبری

یعنی مضامین اتفاقی اور الہامی ہوتے ہیں، اب میں یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ مضامین اتفاقی و الہامی سے کیا مراد ہے۔

آپ ہی انصاف سے دیکھئے کہ جس قسم کے اشعار آج کل ہمارے گُل دستوں میں شائع ہوتے ہیں کیا وہ ع

شاعری جزو یست از پیغمبری

کے مصداق ہو سکتے ہیں۔ لا واللہ ایسا نہیں ہے۔ اس کا ایک سبب کم علمی ہے علم سے مُراد بہت سی کتابیں پڑھ لینا یا کم از کم سلسلہ نظامیہ کو کسی نہ کسی طور سے تمام کر لینا نہیں ہے۔ عقل اور فطرت تحصیل علم کے لئے کافی ہے مگر عقل سے کام لینا اور فطرت میں تصرف کرنا کسی قدر محنت چاہتا ہے اور اس کی ہمیں فرصت نہیں جس قدر مضامین پیش پا افتادہ تھے اُن کو اگلے کہ گئے اب ہماری اُستادی صرف اس سے استنباط کرنے میں صرف ہوتی ہے اور اگر اس کا بھی سلیقہ ہم میں نہیں تو اُس کو اور خراب کرتے ہیں، ہماری شاعری سماعی اور کتابی ہے نہ نظری ہم خود فطرت کو مشاہدہ کر کے غور کرنے اور کتاب فطرت سے مضامین پیدا کرنے کے عادی نہیں ہیں اگلوں کے مضامین کو اپنے لفظوں میں دہرا دینا ہمارا خاص کام ہے اور اسی پر ہم کو فخر ہے۔

علم طبیعیات، الٰہیات اور شعر بظاہر ان کے مقاصد جُدا جُدا ہیں اور

شاعر کو حکیم سے اول مرتبہ پر رکھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حکیم سے وہ کام نہیں ہو سکتا جس کو شاعرِ نازک خیال انجام دے سکتا ہے۔ فطرت سے دقیق مضامین کو اخذ کرنا اور اس کو عام فہم اور موثر الفاظ میں کہہ جانا خاص شاعری کا کام ہے اور کسی سے نہیں ہو سکتا۔ میں اس سے بھی زیادہ ترقی کر کے کہتا ہوں کہ حقائق اور معارف کو جس پیرایہ سے شاعر ادا کرتا ہے فلسفی کی مجال نہیں ہے کہ اسے بیان کر سکے۔ خیال کے آئینہ خانے میں عالم جبروت کی جھلک نظر آتی ہے، پیاری پیاری صورتیں متجسم ہوتی ہیں اور صوت و حرف کے ذریعہ سامعہ تک پہنچتی ہیں۔

شاعری کی وسعت مثل فسحت عالم کے لامتناہی ہے۔ اُس کا جولان گاہ فلسفہ کی حد رسائی سے کہیں آگے ہے۔ جن امور کو فلسفہ نے اب ثابت کیا ہے شاعروں کی تخیل کئی قرن پہلے اُن کو پا چکی ہے شاعر اعلیٰ رموز حکمت کو اِس طرزِ دلاویز سے کہہ جاتے ہیں کہ فلسفی کو اس کے بیان کرنے میں بڑی بڑی دقتیں پیش آتی ہیں، تمہید مطالب اور ترتیب مقدمات میں بہت سا وقت صرف ہو جاتا ہے۔ اور پھر بھی جیسا چاہیئے وہ امر ذہن نشین نہیں ہوتا۔ شاعر کی زبان میں خداداد اثر ہوتا ہے مگر ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاءُ۔ جس طرح کوئی شخص اپنی کوشش سے حسین نہیں ہو سکتا اوسی طرح فطرت سلیم بھی بنائے سے نہیں بنتی، دیکھا گیا ہے کہ اکثر صاحب شعر کہتے کہتے بوڑھے ہو گئے مگر کوئی شعر مزے کا نہ نکلا اور ایک طفل مکتب نے وہ شعر پڑھ دیا کہ مشاعرہ الٹ گیا۔

ممکن ہے میری اس تقریر سے بعض نوعمر شاعر بیدل ہو جائیں اس لئے کہ جب شاعری امر خداداد ٹھہری تو پھر اس کا اکتساب غیر ممکن ہو گیا۔ لہٰذا ہر شخص کو جو

شعر کہنا چاہیئے پہلے یہ دریافت کرنا ضروری ہوا کہ آیا اس کی طبیعت اس کے مناسب ہے یا نہیں۔ اس موقعہ پر صرف یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فطرت نے ہر انسان کو لو اسطہ استعدادات عطا کئے ہیں فطرت کے قواعد کلیہ میں اتفاقات اور عوارض کو بہت کم دخل ہے حد خاص سے زیادہ خوبصورت اور حد خاص سے زیادہ بدصورت بہ مشکل ملیں گے، اس کے علاوہ ملک، مزاج اور عادات کو بھی اس امر میں بہت کچھ لگاؤ ہے فطرت نے ہر ملک کے مناسب ایک صورت خاص اور ایک طبیعت مخصوص ہر باشندے کو عطا کی ہے۔

انگشت نمائی کے لائق معدودے چند ہوتے ہیں۔ اگر فطرت نے کسی کو موزوں طبع نہیں پیدا کیا تو وہ ہرگز شعر موزوں کرنا کیسا موزوں پڑھ نہیں سکتا مگر ایسے ناموزوں طبیعت والے مشکل سے ملیں گے لہٰذا اوسط درجے کے دماغ والے اکثر موزوں طبع بھی ہوا کرتے ہیں مگر اکثر استعدادات بہ سبب عدم مزاولت کے ضائع ہو جاتے ہیں یا بہ سبب عدم علم کے ابتدا خراب ہو کر درستی کے قابل نہیں رہتی۔ جو لوگ ابتدا میں کسی کامل استاد سے موسیقی حاصل نہیں کرتے اور ابتدا ہی میں سُر بیورہ ٹھیک نہیں کر لیتے اُن کو بد آواز اور بے اُصول گانے کی مشق ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہر مبتدی کو اپنی ابتدائی درستی کا خیال نہایت ہی ضروری ہے اگر طبیعت ابتدا ہی میں خراب ہو گئی تو اُستاد کامل کی کوششوں سے بھی کوئی اثر مترتب نہ ہوگا۔ مثلاً ہمارے شہر کے اکثر شعرا اور اُن کے تلامذہ کو مناسبت الفاظ کا لحاظ حد سے زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ ایک صنعت شعری ہے اور محسنات کلام میں داخل ہے مگر اب سلیقہ مند شعرا اس کو عیوب شعر میں شمار کرنے لگا ہے۔ اور اس بد عادت

کا اثر اس قدر شائع و ذائع ہو گیا ہے کہ اب اس کا ترک مِن قبیل محالات سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض تشبیہات جو کسی اگلے استاد نے کسی موقع پر نظم کر دیے تھے۔ اب اس کی اس کثرت سے چھاڑ کی گئی کہ سننے والوں کو ان سے نفرت ہو گئی۔ اور نفرت کی وجہ یہ ہے اولاً یہ غور کرنا چاہیئے کہ :۔

تشبیہہ استعارہ مجاز مرسل کنایہ اور ضائع و بدائع معنویہ و لفظیہ یہ سب مجموعاً و کلیتہً کیوں باعث لذت ہوتے ہیں ؟ اس مسئلہ کا جواب ہم کو علم نفس سے مل سکتا ہے جس کو ہم ابھی بیان کریں گے پہلے اتنا کہہ لینے دیجئے کہ اگر وہ شرط جس کی وجہ سے یہ امور باعثِ لذت ہوتے تھے فوت ہو جائے تو ظاہر ہے کہ اس کا مشروط یعنی لذت بھی فوت ہو جائے گی۔ واضح رائے عالی ہو کہ ان امور میں صرف قوت باعث لذت ہے یعنی قائل کا قول سامع کے لئے صرفِ قوت کا باعث ہوتا ہے۔ قوت سے یہاں قوت ذہنی مراد ہے توجیہ مزید اس کی یہ ہے کہ انسان میں دو سبب لذت کے ہیں (۱) استعمال قوائے بحالت صحت (۲) ارتفاع الم اور وہی استعمالِ قوائے ایک حد خاص سے تجاوز کرنے کے بعد موجب الم ہو جایا کرتا ہے۔ اس صورت میں ترک فعل ضروری ہو جاتا ہے اور یہ دوسری مسئلہ میں داخل ہے یعنی ارتفاع الم ہیں۔

تشبیہات قریب و بعید سننے کے بعد سامع کو قوت فکر کے استعمال کا موقع ملتا ہے اور یہی موجب لذت ہوتا ہے۔ تشبیہہ کی ندرت ایک استعجاب خاص کا باعث ہوتی ہے اور استعجاب خود ایک فعلیت دماغی کا نام ہے کیونکہ اس صورت میں دماغ کے اُن مرکزوں تک اثر پہنچتا ہے جو ایک مدت سے بیکار پڑے تھے۔

تشبیہات قریب و مبتذل میں نہ استعمال قوت کا موقعہ ملتا ہے نہ وہ باعث استعجاب ہوتے ہیں، اس لئے ان میں کسی قسم کی لذت نہیں ہے ایسے مضامین کو سنانا سامعہ خراشی ہے اور سامعہ خراشی درحقیقت ایک امر مولم ہے۔ لہذا اس قسم کے شعر درحقیقت مولم اور موذی ہیں اور ان کے سننے اور سنانے سے احتراز اولیٰ ہے۔

آپ نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہوگا کہ شعر میں کوئی نہ کوئی بات ضرور ہو۔ مجہول الکنہ بات یہی ہے جس کی اصلیت کو ہم نے بیان کر دیا یعنی شعر میں ایسی کوئی بات ضرور ہو جس سے سامع کو قوتِ دماغی کے استعمال کے صرف کرنے کا موقع ملے۔ مگر اس کی بھی ایک حد خاص ہے یعنی صرفِ قوت کو اعتدال ضروری ہے بعض صاحب معنی بند شعر کہتے ہیں ایسے لوگ دہلی میں بہت تھے جن کے ہر شعر کو سمجھنے کے لئے قوت فکر کو حد اعتدال سے زیادہ محنت کرنی ہوتی تھی۔ اس قسم کے اشعار بھی لذت اور تفریح کے لئے مفید نہیں ہیں، ایسے چند شعر سن کر طبیعت تھک جاتی ہے اور پھر اس طرف تادیر متوجہ نہیں ہوتی۔ دماغ کے پردے بہت ہی نازک ہیں ان کی لذت کے لئے نازک خیالیوں کی ضرورت ہے، نازک خیالی اور دقت مضمون دو امر جداگانہ ہیں، ایک کے دھوکے سے دوسرے کو اختیار کر لینا بڑی غلطی ہے

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ شاعری کی وسعت مثل سلطنت عالم کے غیر محدود ہے۔ اس سے میری یہ مراد ہے کہ مبادی مضامین جس کو مبادی تشبیہ بھی کہہ سکتے ہیں لاتعداد و لاتحصیٰ ہیں، ان میں سے بعض کا میں ذکر کرتا ہوں۔

آسماں۔ اس سے ہم کو عظمتؔ، وسعتؔ، رفعتؔ کے ایسے عالی مضامین مل سکتے ہیں مگر ان سب کے ساتھ ہی خوف کی اصل بھی اس میں شامل ہے علم نجوم

کے اعتقاد نے اُس کے ساتھ ہمارے تعلقات کو بہت وسیع کر دیا ہے۔ عام اس سے کہ کسی کو نجوم پر اعتقاد ہو یا نہ ہو زبان مروجہ اس کے لوث سے بہ مشکل پاک ہو سکتی ہے علم نجوم نے آسمان کے صفاتِ اعلیٰ مثلاً فضا اور نظام کے تصورات کو بہت نقصان پہونچایا ہے۔ اب ہمارے شعرا اس کو ظالم اور کج رفتار ہی کے خطاب سے اکثر یاد کرتے ہیں۔ نظام بطلیموسی نے آسمان کو محدود کر دیا ہے اس لیے ہم کو اس کی فضائے لاتناہی کا تصور جس کا بہت اچھا اور عمدہ اثر تخیل بلکہ اخلاق پر ہو سکتا ہے اسے محدود کر دیا۔ مسائل ابتدائی علم ہیئت جس سے کہ اجمالی تصور عالم سماوی کا ذہن میں پیدا ہو جائے شاعر کے لئے منجملہ واجبات ہے۔ صرف نظامِ شمسی جس میں ایک آفتاب اور نو سیارے اور متعدد اقمار شامل ہیں، اگرچہ وہ اس قدر وسیع ہے کہ ہمارا وہم اس کے ادراک سے قاصر ہے۔ پھر بھی کل عالم کی وسعت کے مقابلے میں ایک ذرہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا اس کے ساتھ ہی مجھ کو یہ بھی کہ دینا چاہیئے کہ ہمارے معاصرین اکثر کم میں متصور اور منفعل کے تصور اور تقابل سے بے بہرہ ہیں، اور اس صورت میں ممکن نہیں کہ عالم کی وسعت کا ایک اجمالی تصور بھی اُن کے ذہن میں آسکے۔

عظمتِ مضامین شعریہ میں سے اصل اول ہے، جب اس کے تصور سے شاعر بے بہرہ رہے گا تو اُس کے ذہن پر اصل کا اثر ہی نہ ہوگا اور نہ اشعار میں اس کے ان کا پر تو پایا جائے گا۔ ہم فضائے اثیری اور ان بے شمار اجسام سے جو اس میں ایک وضع خاص و رفتار خاص کے ساتھ حرکت کرتے رہتے ہیں بالکل واقف نہیں نہ ہم کو اجرام سماوی کا وزن اور حجم کو رنگ اور ان کے تغیرات کے

میقات پر اطلاع ہے۔ نہ ہم اس نظام موسیقی سماوی کو سمجھ سکتے ہیں جس کا فیثا غورث نے تقریباً دو ہزار چھ سو برس پہلے ذکر کیا تھا۔ علم موسیقی نظری سے ہم بالکل بے بہرہ ہیں، علم تالیف اور انقاع کو جانتے ہی نہیں۔ چند وزن متعارف کہ جن پر اردو شاعروں نے خامہ فرسائی کی ہے اپنی موزونی طبع کا جولان گاہ سمجھے ہوئے ہیں، مثلاً ہم کو یہ نہیں معلوم کہ کون سا وزن شعری کس قسم کے بیان کے لئے مناسب ہے۔ شاعری ہمارے دو مصرعوں پر موقوف ہے۔ اگر ان میں مناسب معمولی ہوئے اور بعض وہ صنعتیں جو رائج الوقت ہیں شعر میں پائی گئیں تو گویا ہم نے شاعری کا حق ادا کر دیا۔ جس طرح ہمارے مضامین مصنوعی اور غیر طبعی ہیں اسی طرح ہماری طبیعت بھی اس کی معتاد ہو گئی ہے۔ ہمارا مذاق شعر بالکل صحیح نہیں ہے۔ نہ ہم فطرت کی عظمتِ جمال اور لطافت سے متاثر ہو سکتے ہیں اور نہ اس کا انعکاس ذریعہ ہمارے اشعار کے ہمارے سامعین یا ناظرین پر پڑ سکتا ہم نے اصلی باغ کو نہیں دیکھا۔ کاغذ کے کترے ہوئے پھول آرائش کے حوض پر دیکھ لئے ہیں اوسی کو تختۂ گلزار سمجھے ہوئے ہیں۔ ہم نے ریل کا انجن کبھی نہیں دیکھا مگر اپنے قیاس سے (جس کی وسعت معلوم) اس کا نقشہ کھینچنے کے لئے آمادہ ہیں۔ بغیر علم ہیئت کے مبادی کو سمجھے ہوئے ہم کم از کم ایک ثلث اپنی شاعری کا نذرِ غفلت کر دیتے ہیں۔ باقی رہے دو ثلث ان کا حال آئندہ معلوم ہوگا۔ اس مقام پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اگلے شاعروں میں سے بھی اکثر اُن علوم سے بے بہرہ تھے جن کا ذکر اب تک کیا گیا یا آئندہ کیا جائے لیکن اُن کے اشعار مقبول ہیں اگر اگلے شاعروں سے عرب کے زمانہ جاہلیت کے شاعر یا اور

اسی طبقہ کے شعرا جو اور ملکوں اور قوموں میں سرآمدِ روزگار ہو گئے ہیں مراد ہیں تو ہم کہیں گے کہ اُن کی شاعری ہرگز کتابی نہ تھی اُن کے اذہان علوم کتابی سے خالی تھے مگر اُن کا دل فطرت کا آئینہ تھا۔ ان کی توجہ صوت وحرف میں مقید نہ تھی۔ وہ حقیقتوں کا معائنہ اپنی آنکھوں سے کر کے اپنی زبان سے اس کو ادا کر دیتے تھے۔ متاخرین یورپ اس بھید کو سمجھے ہوئے تھے اُن کے شعرا نے اپنی طبیعت کو اس آزادی کے ڈھرے پر ڈال دیا جو شاعری کے لئے موزوں ہے وہاں کا ہر ایک شاعر عجائبات دُنیا کی سیر خوشنما اور جزیروں اور گھاٹیوں اور آبشاروں کو دور دراز سفر کر کے ملاحظہ کرنا۔ تاریخی مقامات پر جانا منجملہ واجبات سمجھتے ہیں۔ لہذا اُن کے اشعار سے ناظرین کو سیر بین کا لطف آتا ہے۔

والٹر اسکاٹ ایک رزم گو شاعر اسکاٹ لینڈ کا رہنے والا تھا۔ اُس کے وطن کے پہاڑ سبزہ زاروں سے آراستہ نہ تھے اُس نے عالم طفولیت و شباب میں انہیں پہاڑوں کی ایک ایک گھاٹی کو نہایت شوق سے دیکھا تھا اُس کو اِس قسم کے سنگستان سے ایک اُنس سا تھا اِن پہاڑوں کی سیر کرنے والوں پر ظاہر ہے کہ سوائے ہول اور وحشت کے اور کیا اثر ہو سکتا ہے ہول اور وحشت کے مقابلے کے لیے انسان میں ایک قوت ہے جس کو قوت غضبی کہتے ہیں اسی قوت کی تہذیب کا نام علم الاخلاق میں شجاعت رکھا گیا ہے۔ لہذا ایسا شخص جس کے نفس پر ہول اور دہشت کا تصور ہوتا رہتا ہے اور وہ عالم خیال میں بسبب اپنی ذاتی شجاعت یا بسبب اُس جوش کے جو شجاعانِ ملک کے تاریخی واقعات پر نظر کرنے اور اُن مقامات کے دیکھنے سے جہاں معارک جدال و قتال

واقع ہوئے ہوں پیدا ہو جاتا ہے۔ مقابلہ کرتا رہتا ہے اگر وہ شاعر ہوگا تو ضرور رزمیہ اشعار خوب کہے گا اور یہی حال اسکاٹ کا ہوا۔ فردوسی کے واقعات پر نظر کرنے سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بدو شعور سے اُس کو دہقان پیر کی زبانی اگلی سپاہگری کے معرکوں کی کہانی سننے میں لطف آتا تھا۔ اس کی طبیعت میں انتہا کی جوانمردی تھی۔ اور جن ملکوں میں اس کو سفر کرنا پڑا وہ انتہائی دشوار گزار اور ہولناک تھے۔ یہی اسباب جمع ہو کے شاہنامہ کی تصنیف کا باعث ہوئے سعدی کی حیات سے ظاہر ہے کہ اس کو سن شباب میں ترکِ وطن کر کے بغداد آنا پڑا اور یہیں وہ طالب العلمی کر کے فاضل مستند کے درجہ پر فائز ہوا۔ پھر اس کو متعدد سفر کرنا پڑے، اور دُنیا کے نشیب و فراز دیکھے بہت بڑا تاریخی انقلاب جو اس کے زمانے میں ہوا وہ سلطنت عباسیہ کا زوال اور سلطنت مُغلیہ کا عروج تھا۔ یہی سبب امور اس کے رنگ طبیعت کے موجب ہوتے۔ اس کے اشعار سے انتہا کی تجربہ کاری پائی جاتی ہے۔ ظرافت و شاعرانہ کمال اس کا ذاتی ہے جس نے اس کے اشعار کو نہایت ہی با مذاق کر دیا۔

خلاصۂ تقریر یہ ہے کہ ذاتی تجربہ کو اس فن میں بہت کچھ دخل ہے تجربہ کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اتفاقات ایسے ہوں کہ اکثر اشیاء کا مشاہدہ ہو جائے مثلاً دور دراز کا سفر خانگی حالات' ملاقات احباب اور جو اسی قسم کے اسباب ہوں یا بذریعہ علم کے قصداً تجربے کئے جائیں جیسا کہ علوم عقلیہ تجاربیہ کا معمول ہے اصطلاحاً جو امور بلا قصد پیش آتے ہیں اُن کو مشاہدہ اور جو بالقصد کئے جاتے ہیں ان کو تجربہ کرتے ہیں۔

ہیں نے اوپر بیان کیا ہے کہ ہمارے اکثر معاصرین تجربہ کم، متصل و منفعل سے بے بہرہ ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ وہ ذہناً اعداد اور ابعاد کا توہم نہیں کر سکتے اگرچہ اس کا علم بھی ہو۔ مثلاً زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے اور محیط پچیس ہزار میل، یہ اکثر صاحبوں کو معلوم ہوگا۔ مگر پچیس ہزار میل زبان سے کہہ دینا یا بذریعہ رقوم و اعداد کے کاغذ پر لکھ لینا کافی ہے۔ اس پچیس ہزار میل کا توہم حقیقی اس کو ہو سکتا ہے جس نے کل زمین کا دورہ کیا یا یہ کہ مثلاً اور ذرائع سے اس کا تصور حاصل کیا ہے۔ ایک یہ کہ اگر ریل گاڑی تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلے اور کسی جگہ نہ ٹھہرے تو آٹھ سو تنتیس گھنٹے بیس منٹ میں زمین کا دورہ پورا ہو جائے گا۔ جس کے چونتیس یوم سترہ ساعت بیس منٹ ہوتے ہیں اگر اس مدت تک ریل گاڑی پر بیٹھے رہیں تو کس قدر کسل ہوگا۔ یا مثلاً پا پیادہ زمین کے گرد سفر کریں، (بشرط امکان) اور بیس میل فی یوم چلیں تو بارہ سو پچاس دن یعنی تین سال قمری چھ ماہ گیارہ یوم میں دورہ کامل ہو جائے گا (تین مہینے تیس اور تین مہینے ۲۹ یوم کے) اجرام سماوی میں افتاب کا اثر تخیل پر سب سے زیادہ ہے اور یہی سبب ہے کہ مذہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ افتاب پرستی بہت ہی قدیم مذہب ہے۔ اکثر زبانوں میں جہات اربعہ کے نام سے وضع سایہ شمس کی پائی جاتی ہے۔ مثلاً لفظ شمال کے معنی بائیں ہاتھ کے ہیں۔ اگر کوئی مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو تو ضرور شمال اس کے بائیں ہاتھ کی طرف پڑے گا۔ افتاب کی حرارت سے قوت قمری اور اشراق اور ضوء سے نور۔ اور ضوء اور حرارت کی آمیزش سے جلال کا تصور پیدا ہوتا ہے ہمارے ملکوں میں گرمی زیادہ ہے۔ اس لئے اس کا

تصورِ الم سے خالی نہیں، سرد ملکوں کے رہنے والوں کا خیال نسبت آفتاب کے جداگانہ ہے۔ ان کے نزدیک اس میں شانِ محبوبیت پائی جاتی ہے اور اس کا انہیں وجدان ہوتا ہے۔ ہمارے ملکوں میں بھی ظہورِ نیرِ اعظم کے وہ اوقات جن میں حرارت اعتدال کے ساتھ ہے نہایت ہی پسندیدہ منظر دکھاتے ہیں۔

شفق سفیدۂ سحری اور طلوعِ آفتاب سے ہزارہا مضامین اخذ کئے گئے ہیں۔ چونکہ آفتاب کا جرم مرئی چھوٹا سا معلوم ہوتا ہے، اور عام نگاہیں اس کی عظمت کی حد تک نہیں پہنچ سکتیں، ایک اجمالی تصور اس امر کا کہ آفتاب زمین سے بڑا ہے شائد اس کا علم عام لوگوں کو بھی ہو مگر وہ کافی نہیں ہے اس امر کا تصور دلوں میں مشکل سے پیدا ہو سکتا ہے کہ آفتاب اور زمین کے قطروں میں (۷۹۱۲) امیال اور (۸۸۷۰۷۰) امیال کی نسبت ہے یا یہ کہ آفتاب زمین سے (۹۵۲۹۸۲۷۰) امیال کی دوری پر ہے اور یہ امور تو اس سے بھی زیادہ بعید از فہم ہیں کہ اِس قدر بُعد سے آفتاب زمین کو کھینچتا ہے۔

ماہتاب آفتاب سے استفادہ حرارت و نور کرتا ہے کسب حرارت کی مثال آتشی شیشے سے بہتر نہ ہو گی جو اس قدر بُعد سے اتنی حرارت جذب کر لیتا ہے کہ آگ لگا دینے کے لئے کافی ہو۔

سوائے ماہتاب کے اور سیارے بھی کسب نور کرتے ہیں اور بہ لحاظ قرب و بُعد اور مسامتت اور عدمِ مسامتت کے کمی اور زیادتی نور کی مثل قمر کے اُن سیاروں میں بھی ہوتی رہتی ہے۔

اجرام سماوی کے اوقاتِ ظہور و خفا اور حرکات مستقیمہ و رجعت وغیرہ

سے شعراء نے بہت کام لیے ہیں۔ اشکال سماوی جن کا تعین اور تسمیہ محض وہمی تھا شاعری میں مدتوں سے جاری ہے ہمارے شعراء کے خیالی آسمان میں اشکال و بروج وغیرہ زندہ موجود رہتے ہیں، اور ان کی طرف صفات مرئی حیات جانوروں کے منسوب کئے جاتے ہیں، مگر اب اس میں کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ اس لئے کہ اثر موہوم واقعیت سے بہت بعید ہو گیا ہے اور اب جس قدر اثر باقی ہے وہ بسبب عدم علم کے لئے ہے۔ ورنہ درحقیقت اُس میں کوئی لطف نہیں ہے۔

یہاں پر ایک نکتہ باریک یہ عرض کرنا ہے کہ ہر تشبیہ کی وسعت وجہ تشبہ تک محدود ہے اس سے زیادہ توسیع لغو محض ہے۔ مثال اس کی یہ ہے کہ معشوقوں کے خط کو سبزہ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اب اُس سبزہ کے لئے کوئی جانور چرندہ قرار دینا یا اس سبزہ کا خشک ہو جانا یا اس سبزہ کا سوکھی گھاس بن کے بھاڑ میں جھونکا جانا یہ مضامین وجہ تشبہ کی حد سے خارج ہیں فلہٰذا لغو ہیں۔

تشبیہوں کو اپنی حد پر رکھنا فطرت سلیم کا کام ہے ورنہ متقدمین اور متاخرین اکثر کے کلام میں یہ نقص پایا جاتا ہے۔ غالباً اِس قانون کی طرف توجہ نہ تھی۔

میں سابقاً عرض کر چکا ہوں کہ ہمارا آسمان ذہنی ہے ہم کو عالم خارجی کے مشاہدہ کا شوق ہی نہیں، اس وجہ سے ہم کو ثوابت اور سیارات ذوات الاذناب شہاب، بروج و اشکال، کہکشاں، خسوف و کسوف، زمین، جو، فضا۔

اہویہ۔ بخارات، طوفان، گرد باد، سحاب، رعد، برق، باراں وغیرہ سے نئی نئی تشبیہیں مل سکتی ہیں، ورنہ یہ مبادی تشبیہہ ہمارے اور نیز ہمارے بعد مدت ہائے مدید تک بلکہ قیامت تک شاعروں کے واسطے کفایت کرتے ہیں مبدٔ فیاض کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا۔ مگر لینے کے واسطے تمیز چاہیئے۔

زمین جس پر ہم آپ رہتے سہتے ہیں یہی کیا کم ہے۔ کوہستان۔ وادی غار۔ میدان۔ جنگل۔ سمندر۔ دریا۔ چشمہ سار۔ آبشار۔ ترائی۔ سراب وغیرہ سب خدا کی قدرت کے نمونے ہیں۔ اِن کے علاوہ زمین پر جو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ از قسم جمادات و نباتات و حیوانات، جمادات میں سے طرح طرح کے خوش رنگ پتھر۔ الماس۔ یاقوت۔ زمرد۔ پکھراج۔ نیلم وغیرہ نباتات میں سے ہر قسم کے درخت ان کے رنگارنگ پھول یا بیج و شاخ و برگ۔ غنچہ۔ ثمر۔ نمو۔ رس یا حیات حیوانی میں سے صحت و مرض۔ استخوان۔ رباطات۔ عضلات۔ دل۔ جگر۔ ریح۔ معدہ۔ طحال۔ سر۔ رُخ۔ دماغ۔ زبان۔ دست و بازو۔ ہاتھ پاؤں پھر ان کے اجزا اور لوازم میں، میں طرح طرح کی منفعتیں اور خوبیاں ہیں جن کی تصویریں شاعروں کو ہو بہو دکھانا چاہیئے ہیں۔

حیوانات مخصوصہ مثل شیر و پلنگ، روباہ، حرس۔ گوسفند گاؤ اور دوسرے وحش و طیر و ہوا وغیرہ و ہوام غرضکہ یہ سب شعرا کے واسطے ہیں۔ مخلوقات الٰہی کے ماورا انسانی مصنوعات سے شعراء نے بہت کچھ مضامین اخذ کئے ہیں مثلاً جہاز و قصر و منار وغیرہ۔

حال کے مصنوعات مثل ریلوے انجن و تار برقی وغیرہ کو ابھی ہمارے

ملک کے شاعروں نے علیحدہ رکھا ہے اس کی وجہ معلوم نہیں۔

فطرت کے ذخائر سے ابھی بہت ہی کم چیزیں ایسی ہیں جن سے ہمارے شعرا نے کام لیا ہے۔ مثلاً اقسام طیور ہی کو لیجیے اہل علوم نے تین ہزار سے زیادہ انواع طیور کا بیان کیا ہے۔ ہمارے شعرا ان میں سے بلبل۔ کبک۔ طاؤس، طوطی۔ قمری۔ زاغ۔ ہما۔ عنقا۔ موسیقار بس انہیں چند جانوروں کا نام یاد ہے ان میں سے موسیقار ہما۔ عنقا محض خیال ہیں۔

علیٰ ہذالقیاس درختوں میں بھی یہی کیفیت ہے۔

اب علوم کی طرف آیئے الٰہیات۔ ریاضیات، طبیعیات۔ علم تمدن، تدبیر منزل علم اخلاق۔ ان علوم کے ان مسئلوں کو شعرا اس خوبصورتی سے بیان کر سکتے ہیں کہ سامع ہر چند کم فہم ہو مگر وہ اسے سمجھ سکتا ہے۔ اگرچہ مبادی تشبیہ کو جس تفصیل کے ساتھ میں بیان کرنا چاہتا تھا وہ اس بے اطمینانی اور تشویش کے زمانے میں مجھ سے نہ ہو سکا۔ مگر پھر بھی آپ اگر ایک نظر اُن امور کی طرف کریں گے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ اور پھر اپنے ملک کی شاعری کو ملاحظہ کریں گے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ ہماری شاعری کس درجہ محدود ہے۔ اور ملکوں کے شاعر دور دراز ملکوں میں جا کر آثار فطرت اور مصنوعات انسانی کا ملاحظہ کرتے ہیں۔ مثلاً یورپ کے شاعر ملک اطالیہ خصوصاً رومتہ الکبریٰ میں جا کر قدیم رومیوں کی عمارت تمدن معابد و ہیاکل کو دیکھنا لازم اور ملک سوئٹزرلینڈ کی جھیلوں کا تماشا واجب سمجھتے ہیں۔ ہمارے وطن لکھنؤ کے شاعروں میں سے اکثر کالے پہاڑ وں تک نہ گئے ہوں گے جو ناف شہر سے دو میل کے فاصلہ پر ہے

یہ آپ خوب جانتے ہیں کہ ہر چہ از نگہ خیزد بر دل ریزد۔ خود شاعر کے دل پر جس چیز کا اثر پڑتا ہے جب اسے وہ بیان کرتا ہے تو اور لوگ بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں ایک ظاہری وجہ تو اس کی یہ ہے کہ جس کا امر تجربہ خود انسان کو نہیں ہوتا اسے وہ بیان ہی نہیں کر سکتا۔

مخلوقات اور مصنوعات عالم خارجی کے سوا عالم ذہنی سے بھی بہت سے مضامین شعرا کو مل سکتے ہیں۔ یعنی ان چیزوں سے جن کو ہم نے بذریعہ کسی حس کے دریافت نہیں کیا ہے۔ بلکہ اُن کا وجود بالفعل ذہنی ہے۔ مثلاً بہشت، دوزخ قیامت، میزان، صراط وغیرہ اس قسم کے مضامین مذہبی تخیلات کے واسطے بہت مفید ہیں۔ علم تاریخ سے شعرا کو بہت سے مضمون مل سکتے ہیں نامی گرامی شعرا کے کلام میں تلمیحاتِ تاریخی ہوا کرتے ہیں۔ تلمیح کا رواج ہمارے شعرا میں کم ہے سبب اس کا یہ ہے کہ واقعات تاریخی نہ عام شعرا کو یاد ہیں نہ عام سامعین اور ناظرین ان کو سمجھ سکتے ہیں لیکن اس قسم کی تلمیحات کو فروگذاشت کرنے کی کوئی وجہ کافی موجود نہیں بلکہ اگر اس کی مراعات لی جائے تو میدانِ شعر وسیع ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ فائدہ بھی ہے کہ وہ واقعات جن کو شاعر نظم کر دیں گے وہ ضرور ہی مشہور ہو جائیں گے۔ ہمارے شہر بلکہ ہندوستان کے فخر دو شاعر میر انیس اور مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہما نے احادیث و روایات کو نظم کرنے کا التزام کیا اور اس قسم کی تلمیحات اپنے کلام میں داخل کئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ اُن کے کلام بلاغت نظام کے دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں ان کو ہزارہا واقعات تاریخی سیرت انبیا اور آئمہ ہدا پر اطلاع ہو گئی۔ اخلاق پر اس سے بہت ہی عمدہ اثر پڑا۔ جیسی

ان دو شاعروں کی تعظیم و توقیر ہوئی اور شعرا کو نصیب ہوئی ہوگی۔ بلکہ میں کہتا ہوں کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا ان کا کلام مطبوع ہوتا جائے گا۔ اس سے زیادہ اُن کا کلام قدر و منزلت کے لائق تھا۔ مگر افسوس کہ اُن کی شاعری کا تعلق فرق اسلام میں سے صرف ایک فرقہ کے ساتھ تھا۔ اگر اس مذہبی خصوصیت سے قطع نظر کر کے دیکھئے تو بھی یہ شاعری قابل قدر ہے۔ یہ خصوصیت تو باعتبار مضامین کے تھی، ایک خصوصیت باعتبار ظاہری کے بھی ہے، وہ یہ کہ جزو اعظم اُن کے مرثیوں کا صرف ایک صنف شعر ترکیب مسدس کے ساتھ مختص ہے۔ ممکن تھا کہ ہر صنف شعر میں مرثیے کہے جاتے یا سوائے ان مضامین کے جو مرثیہ کے ساتھ مختص کر دیئے گئے ہیں عام مضامین حکمت و اخلاق کے کہے جاتے۔

اس موقع پر مجھے یہ بھی کہنا پڑا کہ ہمارے شعرا نے نہ صرف از روئے معنویت بلکہ لفظاً بلکہ وزناً بھی اپنے کلام کو محدود کر دیا۔ بحور اور اوزان جو اردو شاعری میں رائج ہیں وہ بھی بہ نسبت فارسی اور عربی کے کم ہیں۔

بعض صاحب یہ کہیں گے صرف وہی وزن از روئے طبیعت پسندیدہ ہیں لیکن ایسا نہیں ہے۔ اوزان بحور مزاولت سے مطبوع اور پسندیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ بعض اوزان جن کو میں خود بھی غیر مطبوع تصور کرتا تھا مزاولت سے مطبوع ہو گئے۔ اور مزاولت کے واسطے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہے جو وزن اچھا نہ معلوم ہوتا ہو اس میں چند شعر کسی شاعر کے کہے ہوئے یا اپنے آپ ہی چند شعر موزوں کر کے دس بارہ منٹ تک زبان سے پڑھے جائیں یا کم از کم الفاظ وزن کو زبان پر جاری کریں اور اگر مع ترنم ہو تو جلد اثر ہوگا۔

اوزانِ شعر میں اور تصرفات جائز بھی ہو سکتے ہیں بلکہ بعض تغیرات کئے بھی گئے ہیں اور وہ علی العموم پسندیدہ ہوتے۔

ایک اور امر بھی لائقِ غور ہے کہ ہمارے شعر کہنے کا کیا اصول ہے آج کل عموماً غزل گو شاعر زیادہ ہیں۔ کہیں مصرعِ طرح کا دے دیا گیا یا خود کسی استاد کے دیوان کی طرح پسند کی یا خود اپنی ہی طبیعت سے کوئی نئی زمین نکالی۔ اب قافیوں پر نظر کی اور ہر ایک قافیہ کا لگاؤ ردیف کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ اسی اثناء میں ہر قافیہ کے ساتھ مصرعہ کہنے لگے اب ان مصرعوں پر مصرعے لگا دئے چلئے غزل ہو گئی۔ مطلع کہنا ذرا وقت طلب ہے اس لئے کہ اس میں دو قافیوں کا باہمی ربط اور پھر ردیف کے ساتھ دونوں مصرعوں کا علاقہ دیکھنا پڑتا ہے۔

بہر صورت مضامین قافیوں سے پیدا کئے جاتے ہیں، غزل اور غزل کے مثل جو اصنافِ شعر ہیں مثلاً قصیدہ اور ترکیب بند اور ترجیع بند سب کی ترکیب کا اصل اصول یہی ہے۔ مرثیہ میں بند کا پہلا یا چوتھا یا چھٹا مصرعہ پہلے کہہ لیتے ہیں اور پانچ مصرعے اور لگانا پڑتے ہیں، غزل میں مضمون کو سمیٹنا پڑتا ہے اور مسدس میں پھیلانا پڑتا ہے، رباعی میں صرف ایک مصرعہ کہہ کے تین مصرعے اور قوافی کی پابندی سے پیدا کئے جاتے ہیں۔

ان سب اصناف میں شاعر کی طبیعت کو قافیوں کی متابعت کرنا پڑتی ہے۔ مثنوی میں البتہ شاعر کسی قدر آزاد ہوتا ہے۔ ہر ایک مصرعہ اپنی طبیعت سے مضامین کی مناسبت کے ساتھ پیدا کرتا ہے اور دوسرا مصرعہ اس مصرعہ کے کسی قافیہ کی پابندی سے کہنا ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر مثنوی کہنے والے دوسرے مصرعے

برائے بیت لگا دیا کرتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مصرعہ کہا اور دوسرا مضمون جو اس سے دست و گریبان ہے اس مصرعے کے قافیہ کے ساتھ نہیں آتا اس صورت میں سخت افسوس ہوتا ہے۔ نواب مرزا شوق مرحوم کا وہ شعر

عشق کیا چیز ہے بلا جانے
ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں

دونوں مصرعوں میں کیسی مناسبت ہے گویا دوسرا مصرعہ اسی کے لئے تھا مگر قافیہ نہ ملا۔

اسی مشکل پر نظر کر کے متقدمین یونان اور متاخرین انگلستان نے قافیہ کی قید کو اڑا دیا۔ نظم بے قافیہ کہنی شروع کی۔ اس قسم کی نظم کو ہمارے بعض اہل عجم میں نثر مرجز کہتے ہیں۔

جب پہلے پہل انگلستان میں نظم بے قافیہ میں لوگوں نے شعر کہے۔ ڈاکٹر جانسن سے جو اس وقت کے محققین لغت سے تھا لوگوں نے رائے طلب کی، جانسن نے کہا کہ پھر اس کو نثر ہی کیوں نہیں کہتے۔ اگر ہمارے ملک کو اس طرح کہے (بلکہ بعض لوگوں نے کچھ کہا بھی) تو اس کی نسبت یہی کہا جائے گا۔ راقم الحروف نے خود کئی مرتبہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ واقعی کچھ بے تکی نے سی معلوم ہوتی۔

سوائے نثر مرجز کے ایک صنف نظم کی ایسی بھی ہے جس کو موزوں بغیر قافیہ کہہ سکتے ہیں یعنی فرد اس لئے کہ فرد میں بھی قافیہ کی قید نہیں ہے۔ بلکہ بعض محققین کے نزدیک عدم قافیہ فرد میں مشروط ہے اور جو دو مصرعے مقفیٰ

لے بے تکی نظم واقعی اچھا نام ہے اس لئے کہ ہندی میں قافیہ کو تک کہتے ہیں

ہوں انہیں مطلع کہتے ہیں۔ اگرچہ راقم الحروف کے نزدیک فرد میں عدم تقصیر واجب نہیں ہے۔ کیونکہ مطلع ایک جزو غزل یا قصیدہ کا ہے کوئی مستقل صنف شعر نہیں ہے۔ بہر نوع ایک مجموعۂ فردیات کو نظم بے قافیہ سمجھ لیجیے۔ اس صورت میں ایک خاص تصرف کرنا پڑے گا وہ یہ کہ فرد میں ایک مضمون ایک ہی بیت میں ختم ہو جاتا ہے اور مجموعۂ فردیات میں ایک فرد کے مضمون کو دوسری فردوں سے تعلق رہے گا۔ ہمارے ملک میں بھی شاعری کا میلان اسی طرف ہے کہ نظم سے قافیہ کی قید حتی الوسع کم کردی جائے تاکہ شاعر کو خیالات کو آزادی سے موزوں کرنے کا موقع ملے اور یہ میلان اس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنا ترک کیا گیا۔ ذوق کے استاد ناصر کا دیوان دیکھیے سر سے آخر تک سنگلاخ زمینیں بھری پڑی ہیں۔ اگرچہ اس سے شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے مگر کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا سا مضمون ہے۔ خیالات اور جذبات کا لطف نہیں ملتا۔ ہمارے زمانے کے شعرا جن کا کلام مطبوع خاص و عام ہے۔ مثلاً نواب مرزا صاحب داغ دہلوی یا جناب امیر احمد صاحب امیر مینائی یا حکیم ضامن علی صاحب جلال لکھنوی یا اور اساتذۂ حال۔ ان بزرگوں کے کلام میرے دیکھنے سننے میں آتے ہیں میں نے سنگلاخ زمینیں نہیں دیکھیں بخلاف اس کے اگلے شعرا اس قسم کی زمینیں کم و بیش سب کے کلام میں دیکھنے کو ملیں گی۔ اگلے شاعروں میں میر تقی میر بھی سہل اور شگفتہ[1] زمینوں میں شعر کہتے تھے۔

---

[1] شگفتہ زمین سے یہ مطلب ہے کہ اکثر قوافی غزل کے ردیف کے ساتھ مرتبط ہوں۔

ایک تصرف اور راقم الحروف نے تجویز کیا ہے اگر اس طرز پر کچھ نظمیں کہی جائیں تو عجب کیا کہ مطبوع ہوں وہ یہ ہے کہ ایک مصرعہ پر دو دو مصرعے تین تین مصرعے زیادہ لگائے جائیں اور اس قسم کے ہر ایک قطعہ کو ان میں سے ایک دور کہیں اور کم سے کم دو دوروں کے اخیر مصرعے مقفٰے ہوں۔ یہ کچھ ضروری نہیں کہ دور میں تعداد مصرعوں کی مساوی ہو بلکہ کم زیادہ ہو تو کچھ ہرج نہیں ہے اور اس قسم کے بہت سے ادوار کا مجموعہ ایک نظم سمجھی جائے۔

مقصود ان تصرفات سے یہ ہے کہ شاعر کو اپنے خیالات آزادی سے نظم کرنے کی قوت حاصل ہو جب تک ایسا نہ ہوگا۔ شاعری محدود رہے گی۔ پھر قافیہ کی قید بالکل ترک کر دینا یہ بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ بس کوئی نہ کوئی بات ایسی ہونا چاہیئے جس سے دونوں باقی رہیں یعنی آزادیٔ مضمون اور قافیہ۔

میں نے مکرر کہا ہے کہ شاعری اور مصوری دونوں ایک ہی طرح کی صنعتیں ہیں۔ یہ قول حکیم ارسطاطالیس کا ہے۔ اچھا اب یہ تصور کیجیے کہ مصور جب کسی شے کی تصویر بنانا ہے وہ کیا کرتا ہے۔

۱۔ ایک صورت عمل کی یہ ہے کہ اُس شے کو نظر کے سامنے رکھ لے۔ اُس کے اجزا کے تناسبات کے مطابق ہر تصویر کھینچتا ہے۔

۲۔ دوسری صورت عمل کی یہ ہے کہ درجالیکہ شے جس کی تصویر کھینچنا مقصود ہے موجود نہ ہو، متخیلہ میں جو اس شے کی تصویر موجود ہے سطح تصویر پر اُس کی نقل کرتا ہے۔

۳۔ تیسری صورت عمل کی یہ ہے کہ درجالیکہ ایسی شے کی تصویر بنانا ہو جو نہ

خارج میں موجود ہو نہ ذہن میں، متخیلہ سے بعض اجزا کو بعض کے ساتھ ترکیب دے کے ایک جدید صورت اختراع کرتا ہے: مثلاً ایسا شخص جس کے دس سر اور سو ہاتھ اور ہزار پاؤں ہوں یہی تین صورتیں صنعت شعر کی بھی ہیں۔

۱۔ شئے موجود فی الخارج حاضر ہو۔

۲۔ شئے موجود فی الخارج حاضر نہ ہو بلکہ ذہن میں اس کی تصویر ہو۔

۳۔ شئے نہ خارج میں موجود ہو نہ ذہن میں بلکہ ایک جدید اختراع کی جائے۔

ہمارے شعرا کا معمولی یہ طریقہ ان میں سے کسی میں داخل نہیں ہے۔ ہم قافیہ سے مضمون پیدا کرتے ہیں۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستاں ست

نہ ہم خارج سے مضامین اخذ کرتے ہیں نہ ذہن سے، ہم کو اس پر قدرت ہی نہیں کہ کسی منظر کو دیکھ کے زبان قلم سے اس کی تصویر کھینچ دیں۔

نظم ایک طرف، نثر میں بھی جہاں تک میں نے خیال کیا ہے یہی نقص پایا جاتا ہے اکثر ناول جو اس زمانے میں لکھے گئے ہیں اُن سب میں ایک ہی طرح کے منظر ہوتے ہیں اور وہی ہر پھر کے آتے ہیں، جیسے اس شہر میں ایک غریب تھیٹر تھا جسے لوگ مذاق سے چھچھڑا کمپنی کہتے تھے۔ اس میں چند پردے تھے خواہ مخواہ تماشہ میں وہی پردے بار بار دکھائے جاتے تھے خواہ اُن کا محل ہو یا نہ ہو۔

اکثر تقلید پیشہ ناول نویسوں نے رینالڈ کے ناول انگریزی میں پڑھے ہیں

اسی کے مضامین جس قدر یاد رہ گئے ہیں اُس کو اپنے ناولوں میں صرف کرتے ہیں۔ قصہ میں بھی کوئی جدت نہیں ہوتی میں نے کسی انگریزی کتاب میں انگلستان کے ناول نویسوں کے (قصہ) پلاٹ کی ایک عام صورت پڑھی تھی۔ اُس کا ذکر اس موقع پر لطف سے خالی نہیں، واقعی ناولوں میں اِس کے سوا ہوتا ہی کیا ہے۔

ایک باغ میں ایک خوبصورت جوان مِس سے ایک صاحب بہادر کا سامنا ہوتا ہے۔ صاحب بہادر ایک جان سے ہزار جان عاشق ہو جاتے ہیں۔ مِس صاحبہ سے اظہار تعشق کرتے ہیں اور شادی کا پیام دیتے ہیں مِس صاحبہ نیم راضی ہیں۔ صاحب بہادر مفلس ہیں اس لئے مِس صاحبہ کے والد ماجد قطعی انکار کرتے ہیں، دلوں میں محبت رہتی ہے۔ مِس صاحبہ کی شادی ایک اور صاحب سے ٹھہرتی ہے۔ دوسرے صاحب بڑے دولت مند ہیں اس لئے مِس صاحبہ کے والدین کو یہ شادی منظور ہے مگر بڈھے اور بدصورت ہیں، اس لئے مِس صاحبہ کو منظور نہیں، پہلے صاحب سے پھر ایک باغ میں خفیہ ملاقات ہوتی ہے۔ پینگ بڑھتے ہیں مِس صاحبہ کے والدین مشتبہ ہو جاتے ہیں، پہلے صاحب بہادر مِس صاحبہ کو بھگا لے جانے کا بندوبست کرتے ہیں، دونوں کی ایک رائے ہو جاتی ہے۔ صاحب ایک سیڑھی لے کے آدھی رات کو مِس صاحبہ کے بنگلہ کی کھڑکی کے پاس لگا دیتے ہیں، مِس صاحبہ اُتر کے صاحب بہادر کے ساتھ ہو جاتی ہیں کسی دور دراز ملک میں جا کر شادی ہو جاتی ہے۔ والدین سے ترک ہو جاتی ہے۔ صاحب بہادر کے باپ مر جاتے ہیں، بہت سی دولت ہاتھ آتی

ہے کس صاحب کے والدین سے ملاپ ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے ناول نویسوں کے لئے ایسا ہی ایک ڈھانچہ بنا دیا جائے اسی پر ہزاروں ناول نام بدل بدل کر لکھ لئے جائیں۔

ایک اور خرابی ہمارے ملک کے ناولوں میں پردہ کے اصول کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ عوام عشق و عاشقی کو ہر قصہ کی جان سمجھتے ہیں، لذت فراق اور انتظار سب سے عمدہ مضمون خیال کیا جاتا ہے۔ پھر اگر کسی پردہ نشین سے سامنا ہو بھی گیا تو بغیر اس کے کہ اس کی عصمت پر دھبہ لگے، پیام سلام، وعدے وعید، فراق، انتظار یہ کچھ بھی نہیں ہو سکتا اور جب تک یہ نہ ہو قصہ کا مزا کیا۔ لہذا لازم ہوا کہ قصہ میں ناجائز صحبتوں کا تذکرہ ہو اور یہ موجب خرابیٔ اخلاق کا ہے۔ ناول پر کیا موقوف، اور قصے بھی اسی طرح کے ہیں، نواب مرزا شوق کی مثنویوں میں زنا بالجبر کے ارتکاب کا مصنف نے خود اعتراف کیا ہے۔ آفتاب الدولہ قلق نے مثنوی "طلسم الفت" میں جمع بین الاختین کو جائز رکھا ہے۔ قدیم مثنویوں میں میر حسن کی مثنوی بہت مقبول ہے اس میں بھی پہلے ناجائز طور سے وصال ہوا پھر فراق کے بعد شادی ہوئی۔ خلاصہ یہ کہ گناہ گاریوں کا ذکر قصوں کی جان سمجھی گئی۔ اس سے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔ ملکی قانون نے فحش الفاظ کے استعمال سے روک دیا ورنہ اور بھی فصاحتیں صرف کی جاتیں، اگلے قصوں میں ایسے مضامین کبھی ضروری ہوتے تھے۔ کوئی قصہ اس سے پاک نہیں۔

اور اس سبب کا سبب کلی یہ ہے کہ فطرت کے ملاحظہ کا ہمارے ملک میں بہت ہی کم شوق ہے جمال اور عظمت کے تصورات سے اذہان خالی اور

قاصر ہیں نئے مضمون کیونکر نکلیں اور اگر نکلیں بھی تو ردیف اور قافیوں کی قیود کی وجہ سے موزوں نہ ہوسکیں گے، اور اگر کوئی موزوں کرے اور بعض تصرفات کو دخل دے تو نشانۂ تیر ملامت ہوگا۔ اعتبار کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔ استادی میں بٹہ لگ جائے گا۔

اِس سے پیشتر کسی مراسلہ میں ہم نے مُبادی تشبیہہ کو بیان کیا ہے۔ اب ہم بعض اقسام تشبیہہ کو ایک جدید اصول سے بیان کرتے ہیں۔

باعتبار غرض تشبیہہ کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ تشبیہہ سے مشبہ کی توضیح مقصود ہو۔

۲۔ وہ تشبیہہ جس سے کوئی وجدانِ خاص پیدا کرنا مقصود ہو۔

پہلی غرض علمی ہے یعنی مفید ہے علم کے لئے دوسری غرض وجدانی ہے جس سے قبض و بسط مطلوب ہو۔

مثلاً پوپ شاعر کے ایک شعر کا یہ مضمون ہے۔

"کہ انسان کی حیات کا جہاز عقل کی رسیوں اور خواہش کی ہوا کے زور پر چلتا ہے۔"

اِس تشبیہہ میں یہ لطف ہے کہ جس طرح بادِ مخالف جہاز کی رسیوں کو توڑ کے جہاز کو درہم برہم کر دیتی ہے یہی حال ہماری خواہشوں کا ہے جبکہ وہ اعتدال سے متجاوز ہوتی ہیں تو گویا انسانی حیات کا جہاز طوفانی ہو جاتا ہے اور انجام اس کا غرق ہے، یا سعدی کا وہ مشہور شعر:۔

رعیت چو بیخ است و سلطان درخت   درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

صائب اور غنی کے اشعار اسی قسم کے ہیں، ان لوگوں نے اکثر ایسے ہی اشعار کہے ہیں،

بر تواضع ہائے دشمن تکیہ کردن ابلہی ست

پائے بوس سیل از پا افگند دیوار را

اس آخری شعر میں سیل کو ذوی العقول میں سے فرض کر لیا ہے مگر اس قسم کی تشبیہوں میں قوت کم ہوتی ہے اس لئے کہ بعض صورتوں میں عکس غلط ہو جاتا ہے۔ سعدی کا یہ شعر نہایت ہی عمدہ مثال ہے ؎

نہ محقق بود نہ دانشمند　　چار پائے برو کتابے چند

بعض صورتوں میں مشتبہ بہ میں کچھ تصرف کر دیتے ہیں، مثلاً پوپ شاعر نے علم و معرفت کو شراب سے تشبیہ دی ہے اور یہ کہتا ہے کہ ایسی ہے جس کے کم پینے سے نشہ ہوتا ہے اور زیادہ پینے سے دماغ صحیح ہو جاتا ہے۔ یہ خلاف واقع ہے مگر شراب کو لفظ معرفت یا حقیقت کے ساتھ بیان کر دینے سے (جیسا کہ شاعر نے کیا بھی ہے) وہ اعتراض مرتفع ہو گیا۔

دوسری قسم وجدانی تشبیہوں کی غرض عقل سے بالکل مغائر ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی مشبہ کا اثر وجدان پر کم پڑتا ہوا معلوم ہو تو اس اثر کو مشتبہ بہ کے ذریعہ سے بڑھا دیں، مثلاً ارسطاطالیس نے عدالت کو صبح کے تارہ کی تشبیہ دی ہے۔ واقعی عدالت ایک امر معقول ہے اس کا محض ذکر ایسا کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتا ہے جیسا کہ صبح کے تارے کی تخیل سے پڑ سکتا ہے۔

وہ تشبیہیں جن کا اثر وجدان پر پڑتا ہے اصل اُن کی تصویر یا الم یا لذت کا ہے۔ الم کا تصور لذت کے تصور سے زیادہ موثر ہے۔ اسی لئے حکما نے اس

افسانہ کو جس کا انجام غم پر ہوتا ہے زیادہ تر مفید اخلاق بیان کیا ہے بہ نسبت اِن افسانوں کے جن کا انجام شادی پر ہے۔

وہ افسانے جن کا انجام غم ہے ٹریجڈی کہلاتے ہیں جس کو شیخ ابو علی سینا نے طراغودیا کہا (دیکھو کتاب شفا جملہ منطق و بطور یقنیہ (خطابت) اور فوطیقیہ اشعرا وافسانے جس کا انجام شادی ہے۔ کمیڈی کہلاتے ہیں اس کو شیخ نے کمودیا کہا ہے وہ افسانے جن میں ذکر جنگ و جدال کا کیا جاتا ہے ایک کہلاتے ہیں شیخ ان کو افی کہتا ہے۔

علم نفس میں ثابت ہو چکا ہے کہ واقعی لذّت اور الم سے جو اعصاب متاثر ہوتے ہیں وہی اعصاب اس کے تخیّل سے بھی متاثر ہوتے ہیں۔ اگرچہ واقعی تحریک تخیلی تحریک سے باعتبار قوت کے بہت ہی اخف ہوتی ہے۔ اس درجہ خفت کا تدارک اور طریقوں سے کیا جاتا ہے تاکہ اثر تا حد امکان زیادہ ہو جائے۔

وجدانی اثر کے پیدا ہونے کے لئے یہ شرطیں ہیں اوّل مشبہ بہ اور مشبہ میں بحیثیت تاثیر کے مطابقت ہو اور مشبہ بہ اقوی ہو، دوم مبتذل نہ ہو۔ سوم ایک حد خاص سے متجاوز نہ ہو۔

پہلی شرط تشبیہہ کی ضرورت ذاتی سے پیدا ہوتی ہے بالفرض اگر دو وجدان مغائر مشبہ بہ اور مشبہ سے پیدا ہوں تو ضرورت تشبیہہ کی فوت ہو جاتی ہے۔ اگر قوت میں زیادہ نہ ہو تو تخییلی اثر میں بہ نسبت واقعی کے جو کمی ہے اس کا تدارک نہ ہو گا۔ اگر مشبہ بہ اور مشبہ کی قوتوں میں نسبت مساوات کی ہو تو تشبیہہ عقلی ہو جائے گی جس کی غرض محض بیان اور توجیہ ہے نہ تاثیر وجدانی اور

اس حالت میں بھی اعرفیت مشبہ بہ کی مشروط ہے۔ اور اگر قوت میں کم ہو تو غرض تشبیہہ کلیتہً فوت ہو جائے گی۔

دوسری شرط مابہ الامتیاز ہے درمیان تشبیہہ عقلی اور وجدانی کے، بتبدل سے مقصود وہی تشبیہہ ہے جس کی تکرار اکثر ہو چکی ہے جس قدر تکرار زیادہ ہوتی جائے گی غرابت کم ہوتی جائے گی اور اعرفیت بڑھتی جائے گی۔ پس غرابت اور اعرفیت میں نسبت عکسی ہے، غرابت مفید ہے وجدان کے لئے اور اعرفیت مضر ہے برعکس اس کے اعرفیت مفید ہے ترجیہ کے لئے نہ صرف غرابت، بلکہ لازم اور ملزوم کا بُعد بھی تشبیہہ وجدانی کے لئے مشروط ہے تاکہ تصادم ملائم سکے لئے مفید ہو۔

تصادم ملائم اسی حالت میں پیدا ہو گا جبکہ لازم اور ملزوم میں بُعد ہو اور ایک کے ذریعہ سے دوسرے کا علم بُعد غور و فکر کے حاصل ہو سکے۔ راقمہ

ادا کی شوخیوں سے اُٹھتے اُٹھتے جھک گئیں نظریں
مری قسمت سے اُن کے تیر بھی آئے کمان ہو کر

تیر کے کمان ہو جانے اور عدم تاثیر میں جس قدر غرابت اور بُعد ہے وہ ظاہر ہے، یہ تشبیہہ قسم عقلی میں داخل نہیں ہے۔ اس لئے کہ باعتبار اعرفیت کے خود مشبہ زیادہ تر اقوی ہے یعنی عدم تاثیر افعال معشوق بانسبت عاشق" اور مشبہ محض ایک امر اختراعی وہمی ہے جس کے وقوع کو عقل خارج میں تسلیم ہی نہیں کر سکتی پس اثر اس تشبیہہ کا محض وجدانی ہے جو غرابت تشبیہہ سے پیدا ہوتا ہے۔

تیسری شرط جس کو اعتدال سے تعبیر کرنا چاہیئے۔ شرائط استحالیہ میں سے ہے مگر ازبسکہ عدم اعتدال وجدان کے باب میں اس درجہ مضر ہے کہ غرض اصلی فوت ہوجاتی ہے اس لیئے اس کو بھی شرائط موجبہ ذاتیہ میں سمجھنا چاہیئے مثال عدم اعتدال کی مثلاً معشوق کے ظالم ہونے کی تشبیہہ، مثلاً معشوق کو باعتبار ظلم کے قصاب سے تشبیہہ دینا یا مصرعہ مشہور ہے ع

دوسرا دنیا میں اب چنگیز خاں پیدا ہوا

کبھی ایسا کرتے ہیں کہ جب مشبہ بہ حد اعتدال سے زیادہ اقوی ہو تو اس کی قوت کو کسی تصرف مناسب کے ذریعہ سے کم کر کے حد اعتدال پر لے آئیں مثلاً سید انشاء اللہ خاں انشاء مرحوم کا یہ مشہور شعر ہے

یہ غضب کا ماجرا ہے کہ بروز عید قرباں

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

اس شعر میں عید قرباں کی قید تشبیہہ حد اعتدال میں آگئی ہے قصاب اور عید قرباں کے دن ذبح کرنے والا اگرچہ دونوں کے فعل یکساں ہیں مگر باعث ان کے جدا گانہ ہیں تشبیہہ عقلی سے اثر وجدانی نہیں پیدا ہوتا لیکن تشبیہہ عقلی کو وجدانی کے ساتھ ترکیب دینے سے لطف تشبیہہ زیادہ ہوجاتا ہے :۔ غالب

چال جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کہ جا کرے کوئی

کڑی کمان کا تیر باعتبار سرعت سیر کے تشبیہہ عقلی ہے اور باعتبار قوت تاثیر کے تشبیہہ وجدانی ہے اور دلیل اس امر کی کہ قصد شاعر دونوں پہلو سے وجہ شبہ کی لئے ہوئے ہے ۔ دوسرا مصرعہ ہے ۔ کما ہو ظاہر :۔

ترکیب تشبیہ عقلی اور وجدانی کی افصح العرب بعد النبی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا یہ مشہور شعر ہے۔

جراحات السنان لہا التیام　　　ولا یلتام ما جرح اللسان

اس شعر میں قرینۂ قصد وجدانی کا لفظ جرح ہے۔

نمبر (۳)

میرے مراسلہ سابق میں تشبیہ کا بیان ختم ہو گیا یعنی جو کچھ مجھے ان مراسلات کی حیثیت میں تشبیہ کا ذکر کرنا تھا وہ ہو چکا۔ اب میں استعارہ کے باب میں کچھ مختصراً لکھنا چاہتا ہوں۔

قدما کا یہ خیال ہے کہ تشبیہ کو علم بیان کے مباحث میں خاص دخل نہیں ہے نہایت درست ہے اس لئے کہ فن بیان کا مقصود یہ ہے کہ ایک مطلب کو کئی طرح سے ادا کر سکیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ الفاظ کو ان کے معانی غیر موضوع لہا میں استعمال کیا جائے اور تشبیہ میں یہ صورت نہیں ہوتی مثلاً یہ کہنا کہ "معشوق کے چہرہ کی رنگت گلاب کے پھول کی ایسی ہے" اس جملہ میں کوئی لفظ غیر معنی موضوع لہٗ میں نہیں استعمال کیا گیا۔ لہذا تشبیہ میں کوئی بیانی قوت نہیں ہوتی۔ البتہ استعارہ میں یہ قوت موجود ہے جس میں مشبہ بہ کے عین مشبہ ہونے کا اعادہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً معشوق کو گل کہنا۔ یا مرد شجاع کو شیر کہنا۔ اور تشبیہ میں عدم قوت اور استعارہ میں وجود قوت کی وجہ یہ ہے کہ استعارہ میں مستعار منہ کی تخیل کے ساتھ مستعار لہ کے تخیل نہ ہونے سے

پورا اثر مستعار منہ کے تخیل پر پڑتا ہے اور اس کا وجہ جامع میں اقوی ہونا مشروط ہے۔ لہٰذا وجدانی اثر خواہ مخواہ زیادہ ہوگا اور چونکہ تشبیہہ میں ادائے تشبیہہ کے ذریعہ سے یہ بات کھول دی جاتی ہے کہ مشبہ بہ اور مشبہ دونوں متغائر ہیں لہٰذا یہ قوت باقی نہیں رہتی۔ اگر کوئی یہ کہے کہ قرینہ سے بھی مغائرت طرفین کی ظاہر ہوجاتی ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ قرینہ سے اُس قدر وضاحت نہیں ہوتی ہے جیسے کہ ادات تشبیہہ سے ممکن الوقوع ہے ۔ایک اور وجہ استعارہ کے اقوی ہونے کی یہ ہے کہ بسبب حذف کر دینے ذکر مستعار لہٗ اور بسبب موجود ہونے ادات تشبیہہ کے بہ نسبت تشبیہہ کے اس میں ایجاز زیادہ ہوتا ہے اور ایجاز ہی وجہ سے یہ جامع یا ناظر کی تخیل کو قوت از نکاز کے زیادہ تر صرف کرنے کا موقع ملتا ہے اور اس قسم کے صرف قوت کو ہم پہلے کسی موقع پر کہہ چکے ہیں کہ بنا بر عام قانون مسرت کے مسرت کا باعث ہوتا ہے مثل تشبیہہ کے استعارہ کے بھی تین مد ہیں (۱) توضیح مطلوب (۲) تخیل وجدان (۳) تعجب ملائم یعنی یا تو استعارہ کا یہ مقصود ہوگا کہ جو امر ہم کو بیان کرنا مطلوب ہے اس کو اس طرح بیان کریں کہ سامع یا ناظر ہمارے مطلب کو بخوبی سمجھ سکے یا یہ ہوگا کہ سامعین یا ناظرین کے ذہن میں جو اثر از قسم لذت و الم ہم پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ پیدا ہوجائے یا یہ کہ ان دونوں میں سے کوئی مقصود نہ ہو بلکہ صرف یہ مطلوب ہو کہ ذہن پر ندرت استعارہ کے حصہ سے تعجب کی حالت پیدا ہو اور اس قسم کا تعجب نہ تو اس حد کا ہو کہ اس سے ہنسی آئے اور نہ ایسا ہو کہ اُس سے قوت غضبی کو تحریک ہو کیونکہ یہ دونوں وجدانیات داخل ہو جائے گی اگرچہ وجدانی اثر سے استعارات غیر

وجدانی بالکل معرا نہیں ہوتے تقسیم کی بنا شدت اور خفت کے اعتبار سے ہے ورنہ عدم وجدانی عدم حس کو مستلزم ہے اور عدم حس عدم علم کو۔ اسی بنا پر تقاسیم ذہنیہ اکثر شدت اور خفت کے اعتبار سے ہیں اس امر کو ہم بحث تقاسیم ذہن میں کسی قدر بیان کر چکے ہیں۔

ایک عام فائدہ استعارہ کا اور بھی ہے اس کا ذکر اس موقع پر غیر مناسب نہ ہوگا کہ استعارات باعث ترقی زبان کے ہوتے ہیں اگر الفاظ صرف معنی موضوع لہ میں استعمال کئے جاتے تو کسی زبان کی ترقی ایک محدود وسعت سے زیادہ نہ ہوتی۔

زبان قلم، لب دریا، تیغ زبان، آئینہ دل، رکن سلطنت، دامن آرزو، گل مراد، سبکدوشی، عرق ریزی، جانفشانی وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے بے شمار استعارے زبان میں داخل ہو کر اس کی وسعت کو بڑھاتے ہیں اور یہ استعارے ملک اور قوم کی شاعرانہ قابلیت کی ترقی کے ساتھ روز بروز زیادہ ہوتے جاتے ہیں، یہ مثالیں جو اوپر لکھی گئی ہیں، ان سب کو شاعروں کی تخئیل نے پیدا کیا ہے اور پھر ان کی زبان سے نکل کے اب عام ملکیت ہو گئے ہیں، ہر شخص ان کو نہایت آزادی کے ساتھ استعمال کر سکتا ہے لیکن اس موقع پر ایک امر قابل غور ہے وہ یہ کہ ان الفاظ کی ترکیب ہی سے ان کے نو ایجاد ہونے کی دلیل ملتی ہے اس امر کے تسلیم کرنے میں بظاہر کسی کو کلام نہ ہوگا کہ بخلاف کہنگی زبان کے مقابلہ میں یا ان الفاظ کے جن سے یہ لفظیں بنی ہوئی ہیں ان مرکبات کے وضع تاریخ کو کچھ زیادہ عرصہ نہ ہوا ہوگا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ استعارات لطور دجی و

الہام کے نہیں آئے غرضیکہ ہم تم ایسے لوگوں نے ان کو وقتاً فوقتاً بنا لیا ہے۔ عام اس سے کہ ان مرکبات کے وضع یا اُن کے رواج دینے والے عجم ہوں یا ہندی پھر اس کی کیا وجہ کہ اب ایسے مرکبات جدید نہیں پیدا ہوتے۔ کیا ان مرکبات کے بنانے والے ایزدی سروشش تھے کہ جو کچھ وہ کانوں میں پھونک گئے ہیں، بس انہیں کے ہم استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم بھی آخر انسان ہیں، کولھو کے بیل نہیں کہ آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے اور ایک خاص چکر پر ہمیشہ کیلئے پھرتے رہنے پر مجبور کر دیتے گئے ہیں۔ آخر یہ غلامانہ تقلید تا کے، اندھے بھی لاٹھی کے سہارے نئے نئے راستوں پر چل لیتے ہیں پھر ہم ہی کیوں اس قدر مجبور ہیں؟ واقعی ہماری تقلید بیشگی رحم کے قابل ہے۔

مرکبات غیر امتزاجی کے وضع کرنے میں تو ہم اس قدر مجبور ہیں کہ اگر کوئی نئی ترکیب ہماری زبان سے نکل جاتی ہے تو ہم قصوروار ٹھیرائے جاتے ہیں پھر ہم حیران ہیں کہ مرکبات غیر امتزاجی کے باب میں تو کچھ کلام کرنا ہی بیکار ہے کیونکہ اس کی وضع میں ہم بدرجہ اولیٰ مجبور ہیں۔

حالانکہ زبان کی ساعت پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ نہ صرف مرکبات غیر امتزاجی و امتزاجی بلکہ الفاظ جن کو ہم مفردات سمجھے ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر دراصل مرکبات ہیں اور پھر ان سے پہلے جو صورت مفردات کی تھی اس کے دریافت کرنے سے علم تاریخ لغت عاری ہے۔

وجوہ تسمیہ پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برسبیل ارتجال بہت سی چیزوں کے نام ہیں کیونکہ اگر وجہ تسمیہ کی بنا کسی معقول امر پر نہ ہو تو ضرور

ہے کہ یہ ترجیح بلا مرجح لازم آئے گی۔ کیا وجہ ہے کہ اس چیز کا یہی نام رکھا گیا اور وہ نام نہ رکھا گیا۔ گھوڑے کو گھوڑا اور بندر کو بندر کہنے کی کوئی وجہ ضرور ہوگی۔ وحشی قوموں کی حالت پر غور کرنے سے کچھ اس بات کا پتہ مل سکتا ہے، غالباً اکثر ناموں کے رکھنے میں ابتداءً نقل صوت سے کام لیا گیا ہوگا۔ مثلاً صر یا صریر یا زنبیل وغیرہ اور اس کے بعد جب گرد و پیش کی چیزوں کے نام رکھ لئے گئے ہوں گے تو مرکبات تشبیہی سے بہت کچھ کام لیا گیا ہوگا۔ جب یہ ایک قدرتی الفاظ کی وضع اور ساخت کا ہے تو ہم اس طریقہ کو کیوں بھول جائیں اور کیوں اپنی شاعری کے لئے حضرات عجم کی پابندی کو واجب و لازم سمجھا کریں۔

کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

غرضیکہ بے جا تقلید نے نہ صرف ہمارے خیالات کو بلکہ زبان کو بھی روک دیا ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ اُنہیں باتوں کو خیال میں لائیں، جن کو اگلے خیال میں لا چکے ہیں، اور وہی لفظیں بولیں جن کو اگلے بول چکے ہیں، اس صورت میں شعر گفتن چہ ضرور۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ تفنن طبع کے لئے اساتذہ کے منتخب شعر یاد کرلیں اور انہیں کو حسب موقع پڑھ لیا کریں اور جب بہت گھبرائیں تو انہیں گنگنایا کریں یہ بات خیال ہی میں نہیں آتی کہ ہمارے ذہنوں سے قوتِ ایجاد کیوں سلب ہوگئی ہے۔ کس قدر قابل تاسف یہ امر ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں مغرب کی طرف کیسے کیسے ایجادات ہوئے، کیسی عمدہ عمدہ کلیں نکالی گئیں، کیا کیا آلات بنے۔ اگر آپ یورپ و امریکہ کے علمی اخبار دیکھتے تو معلوم ہو کہ ہر ہفتہ میں نئے نئے ایجادات ہوتے رہتے ہیں۔ نئی نئی کلوں کی فرمائشیں ہوتی

ہیں بعینہٖ اُسی طرح جیسے آپ طرح کا مصرعہ مشتہر کرتے ہیں ان ملکوں میں کلوں کی فرمائشیں ہوا کرتی ہیں اور دوسرے ہفتہ میں موجدائس آلہ یا کل کا نقشہ اور ترکیب شائع کر دیتے ہیں، مگر ہمارے ملک میں صرف خیالی ایجاد یعنی مضامین شاعرانہ کی قابلیت بھی مسلوب ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ اور سبب اس عدم قابلیت کا وہی جہل مرکب ہے جس کو حکمائے اخلاق لاعلاج کہتے ہیں۔ مادہ ایجاد کے روکنے والے ہمارے ملک کے بے جا اور بے محابا معترض ہیں جن کی کوتہ نظری اور تاریک خیالی ان کو کسی نئی بات کے سننے کی اجازت نہیں دیتی، اس میں شک نہیں کہ شاعرانہ مذاق ایک اکتسابی امر ہے اور جو لوگ اس کی طرف توجہ کرتے ہیں تھوڑے عرصہ بعد ان کو کسی نہ کسی حد تک اچھے برے کی تمیز ہو جاتی ہے اس سبب سے خواہ اپنا شعر ہو یا پرایا اس کا حسن و قبح معلوم ہونے لگتا ہے۔ ضرور جی چاہتا ہو گا کہ کوئی نئی بات نکالیں اور نکالتے بھی ہیں مگر معترض بالمکین کے شکوہ میں دب کر کچھ نہیں کر سکتے بامزہ اور رنگین اشعار کے نہ کہے جانے کا یہی سبب ہے۔ مگر از بسکہ انسان کی طبیعت جدت پسند ہے۔ لہذا اکثر شوخ طبیعتوں نے وہ پیرایہ اختیار کر لیا ہے جسے اس زمانے میں ظرافت کہتے ہیں کیونکہ اس صورت میں اکثر قیود سے آزادی مل جاتی ہے۔ اگرچہ اُس کلام کو وہ وقعت حاصل نہیں ہو سکتی جو سنجیدہ کلام کے لئے مخصوص ہے اور وہی اس کا مستحق ہے لیکن اُن کا کلام ظریفانہ ہنسنے ہنسانے کے لئے عمدہ ہے۔

اور وہ کلام جسے سنجیدہ کہنا چاہیئے اُس کا تو بالاکثر یہ حال ہے کہ اُس پر نہ کسی کو رونا آتا ہے نہ ہنسی نہ منہ سے واہ نکلتی ہے نہ دل سے آہ۔ یعنی اُس

کا فیشن اور اس کا طرزِ بیان ایسا کہنہ اور مندرس ہو گیا ہے کہ اب اُس میں کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ اس حالت کی ترمیم کسی نہ کسی طرح ضرور ہونا چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ لوگ جو ان باتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس طرف متوجہ ہو جائیں؛

مراسلہ نمبر ۴

اس میں شک نہیں کہ استعارہ بہت مشکل صنعت ہے اور اس کے استعمال میں اکثر غلطیاں واقع ہو جاتی ہیں، جس سے استعارہ بدنما معلوم ہوتا ہے لہٰذا شاعر کو بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے تاکہ صنعتی غلطیاں نہ ہوں، یہاں ہم بعض امور کا ذکر کرتے ہیں جن سے احتیاط لازم ہے۔

دو یا زیادہ استعاروں کو ملا دینا یہ خطا اس طرح واقع ہوتی ہے کہ اولاً ایک چیز کو کسی چیز سے استعارہ کیا اور پھر اُس کے ساتھ مناسبات کسی اور چیز کے بیان کر دیتے، مثلاً معشوق کے چہرہ کو گل سے استعارہ کیا اور مناسبات ماہ کے ذکر کر دیتے۔ اس قسم کی غلطیاں اکثر اشعار میں پائی جاتی ہیں مگر کون کہے اور کس سے کہے ے

مہندی مل کر ترک ستم ایجاد آیا
خون بہا ہاتھ میں لیتا ہوا جلاد آیا

یہ شعر کسی کا بہت مشہور ہے، معشوق کو ترک کہا پھر اس کا مہندی لگانا کیسا، یہ غلطی اکثر شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔

استعارہ کے مناسبات غیر متعلقہ کو ذکر کرنا یہ بھی نہ چاہیئے، یہ غلطی اکثر مراعات النظیر کی حد مراعات غیر واجب سے پیدا ہوتی ہے ناسخ کا شعر ہے ؂

جگر بھنتا ہے اک سو اک طرف کو زخم پکتے ہیں

تر دد خانۂ دل میں ہے غم کی مہمانی کا

ماخذ اس اہتمام کا یہ ہے کہ غم کی نسبت مشہور ہے کہ اُس سے آدمی دُبلا ہو جاتا ہے اور دُبلا ہونا موقوف ہے خون کی کمی پر اس لئے کہا گیا ہے کہ غم خون پیتا ہے اب دوسرا استعارہ یہ کیا گیا کہ دل کو گھر سے تشبیہہ دی پھر اُس کو باورچی خانہ بنایا غرضیکہ اس قدر مہتمم بالشان مضمون مگر ہیچ بلکہ مکروہ۔

اِن دونوں غلطیوں سے احتراز واجب ہے، اگر شاعر کو مظنہ یا وہم ہو کہ اُس کے کلام میں اس قسم کے سقم موجود ہیں تو چاہیئے کہ اپنے کلام پر معاندانہ نظر کرے اور اِس قسم کے اسقامِ کو نکال ڈالے۔

اب ہم بعض صنائع کا ذکر کرتے ہیں جن کے نشان ہماری شاعری زبان میں پاتے جاتے ہیں منجملہ اُن کے جن کی بنا مماثلت پر ہے ایک تمثیل ہے یہ نہایت ہی عمدہ اور مفید صنعت ہے خصوصاً بچّوں کی تعلیم کے لئے بہت کام کی چیز ہے مثلاً قصص لقمانیہ، ہماری زبان میں تمثیل کی کوئی مثال موجود نہیں ہے نظیر اکبر آبادی کا ”ہنس نامہ“ اکثر فقیر ڈھنڈوں پر گاتے پھرتے ہیں، نفس ناطقہ انسانی اور اسباب مادۂ فانیہ کا ارتباط اور افتراق اس میں بیان کیا گیا ہے۔

مجاز مرسل کے بعض اصناف بھی مماثلت پر مبنی ہیں، مثلاً کل کو نجبر سے تعبیر

کرنا یا اُس کا عکس اگرچہ اُس کو علاقہ غیر تشبیہہ کے اقسام میں داخل کیا ہے لیکن درحقیقت بنا اُس کی تشبیہہ ہے۔ دوسری قسم مجاز مرسل کی اسکندو نیحیہ یہ لفظ یونانی ہے معنی اس کے ایک شے کے ساتھ دوسری چیز کا پاجانا مقصود اس صنعت کا یہ ہے کہ کسی چیز کو باعتبار اس کے ملازمات کے تعبیر کریں عام اس سے کہ ملازم اس کا جزو یا سوائے جزو کے کوئی اور امر ہو از قبیل اغراض وغیرہ۔

ایک صنف اس کی یہ ہے کہ جزو شے سے شے کا اسم اخذ کریں اور اس حالت میں ظاہر ہے کہ وہی جزو اختیار کیا جائے گا جو عند الفہم یا عند العقل اقوی ہو مثلاً کہیں کہ ہاتھ خالی نہیں ہے اور اس سے مراد عدیم الفرصتی ہو۔ اور اس صورت میں عکس بھی بہت موثر ہوتا ہے اور اس صنعت کے اصناف سے ہے کسی شے کو اُس کے مادہ سے تعبیر کرنا مثلاً چاندی سونے سے مراد روپیہ اور اشرفی نہیں، اور انہیں اقسام میں داخل تبادلہ کہ صفات مثلاً بستر غم کہنا اور مریض کو مراد لینا یا صف ماتم کہنا اور اہل عزا مراد لینا۔ گوش شنوا کہنا اور شنونده کو مراد لینا۔ اور اسی قبیل سے مطلق کو مقید سے تعبیر کرنا اور اس کا عکس اور اسی قسم سے ہے نوع کو جنس سے تعبیر کرنا اور اس کا عکس، وہ صنائع جن کی بنا لزوم ذہنی پر ہے تمام صنائع کو ایک ہی نام سے تعبیر کیا ہے یعنی مجاز مرسل اور اُس کے اکثر اقسام علم بیان کی کتابوں میں مفصل بیان کئے گئے ہیں، بنا ان صنائع کی لزوم پر ہے خواہ وہ لزوم اس طرح سے ہو کہ دو چیزوں میں مقارنت ہو بر سبیل طبیعت یا بر بنائے عادت اور جبکہ طبیعت اُس کی بنا ہو تو اُس کی بھی دو صورتیں ہیں یا یہ کہ ایک دوسری چیز کا جزو ہو یا نہ ہو۔

مطانومیہ[1] مجاز مرسل کی وہ قسم ہے جس میں دو چیزوں کی منافت باعتبار لزوم عادی کے ہو اس کے اقسام میں سے ایک علامت ہے۔ مثلاً تاج و تخت سلطنت کے لئے کاسہ گدا کے لئے آلہ ذوالالہ کے لئے مثلاً قلم دبیر یا شاعر کے لئے یا تلوار سپاہی کے لئے ظرف مظروف کے لئے مسبب سبب کے لئے مثلاً ریش سفید مرد کبیر السن کے لئے صانع مصنوع کے لئے مثلاً حافظ کہیں اور دیوان حافظ مراد لیں مثل استعارہ کے مجاز مرسل زبان کی ترقی کے لئے بہت مفید ہے ہزارہا معانی اس صنعت کے ذریعہ سے ادا کئے جاتے ہیں۔

استعارہ یا مجاز مرسل کے ذریعہ سے جو جدید اسما یا افعال لغت میں زیادہ ہوتے رہتے ہیں اُن کے لئے دو زمانے ہوتے ہیں ایک وہ زمانہ جب وہ نئے نئے وضع کئے جاتے ہیں یعنی جب کہ ذہن اصل ماخذ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اُس وقت میں وہ اشعار کے لئے مفید ہوتے ہیں دوسرا وہ زمانہ جب کہ ذہن اصل ماخذ کی طرف حرکت نہیں کرتا اسی زمانے میں ان کی قوتِ شعری سلب ہو جاتی ہے اب وہ ایک لغت کے طور پر باقی رہ جاتے ہیں اس مطلب کو سمجھ کے شاعر یا منشی کو چاہیئے کہ جب اس قسم کے الفاظ کام میں لائے جن کی بنا کسی صنعت شعری پر ہو تو یہ ضرور ملاحظہ کرے کہ آیا اب اس کی قوت ویسی ہی ہے یا اس سے کچھ کم جو ابتدائے وضع میں تھی اور اگر ایسا نہیں ہے تو ایسے الفاظ

---

[1] لفظ مطانومیہ کے معنی یونانی زبان میں تغیر علم کے ہیں یعنی کسی چیز کے نام یا علامت کو بدل دینا۔

کا استعمال مقصود شعری کے لئے مفید نہ ہو گا۔

مراسلہ نمبر ۵

یہ مراسلہ میرا شاعری اور فلسفے کے تقابل میں ہے۔ جن صاحبوں نے میرے پچھلے مراسلات پڑھے ہیں ان کو اس مضمون سے زیادہ لطف آئے گا۔

ہم اگلوں سے سنتے آئے ہیں کہ شاعری حکمت کی چھوٹی بہن ہے واقعی کیا اچھی تشبیہ ہے ان دونوں کی صورت اور مزاج کی یک رنگی اور اتحاد ایک مختصر مگر عام فہم عبارت میں صرف اسی قریبی رشتہ سے سمجھائی جا سکتی ہے ایک نو خیز پر مذاق وارفتہ مزاج علم دوست طبیعت بمشکل ایک کو دوسرے پر ترجیح دے سکتی ہے اگر ایک دل آرا ہے تو دوسری بھی ضرور دلفریب ہے۔

ہومر[۱] سا پختہ کار عالی دماغ شاعر ہو حکیم نہ ہو۔ افلاطون[۲] نکتہ سنج نغز گفتار حکیم ہو شاعر نہ ہو۔ ایک کو شاعری کی شوخ نگاہی نے اور کافرادائی نے سب طرف سے پھیر کر لبھایا۔ دوسرے کو فیلوسوفیہ[۳] کی شرم آلود نگاہیں ہیں اور دیر آشنائی نے

---

۱ ہومر واسطے اخذ معاش کے لئے اپنے اشعار کو گا کر روٹی کماتا تھا

۲ افلاطون نے سقراط کے وعظ کے اثر سے فوراً شاعری کو ترک کیا اور بیس برس تک جو کچھ کہا تھا اس کو جلا دیا۔

۳ ذطیقہ یعنی شاعری و فیلوسوفیہ یعنی فلسفہ یہ دونوں لفظیں یونانی ہیں مونث ہیں اگرچہ ہماری زبان میں فلسفہ کو لوگ مذکر بولتے ہیں لیکن اس کا مرادف حکمت مونث ہے لطف تشبیہ لفظی صرف اس صورت میں باقی رہے گا جبکہ دونوں مونث ہوں میرے قلم سے اکثر فلسفہ بصیغہ مونث نکل گیا۔

لڑکپن کی منگیتر سے چھوڑا کر اپنا بنا لیا۔ پھر نہ اس شاعر دل سے اس پاک محبت کا مذاق چھوٹا جو شاید کسی دنیاوی غیر ارادی سبب نے اس سے چھوڑا دیا تھا اور نہ اُس حکیم کے سر سے اس نشہ کا خمار اُترا جس کو کسی ناصح مشفق نے ملامت کی ترشی سے دفعتہً اُتار دیا تھا۔

مشیت نے جس کو جس کام کے لئے بنایا تھا وہ اُس سے خوب بن آیا دونوں اپنی اپنی قسمت پر راضی رہے اور لطف اُٹھایا کئے۔

صرف انہیں دو مثالوں پر منحصر نہیں میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے حکیم اس دنیا میں فی الحقیقت شاعر تھے اور بہت سے شاعر فی الحقیقت حکیم تھے میں کچھ اس پر بھی ترقی کیا چاہتا ہوں اور کہتا ہوں کہ ہر ایک حکیم ایک اعلیٰ درجہ کا شاعر ہے اور ہر ایک شاعر ایک ادنیٰ درجہ کا حکیم ہے حکمت اعلیٰ درجہ کی شاعری ہے اور شاعری ادنیٰ درجہ کی حکمت ہے۔

حکمت اور شاعری دونوں کا تعلق ذہن انسان دو مختلف قوتوں سے یا یوں کہو کہ ذہن انسان کے دو مختلف فعلوں سے ہے جن کا نام تعقل اور تخیل ہے مگر یہ دونوں قوتیں یا فعل بلکہ کل قوئی اور افعال ذہنی باہدگر کچھ اس طرح مرتبط ہیں کہ ایک کا نقص فرض کر کے دوسرے کی تکمیل تجویز نہیں ہو سکتی۔

ہر انسان کا ذہن دوسروں کے ذہن سے بلحاظ کمی اور زیادتی قوائے ذہنیہ کے مختلف ہے مگر کسی قوت ذہنی کا ایک معیار خاص سے کم ہو جانا ایک قسم کی دیوانگی ہے اور ان سب قوتوں کے اعتدال کا نام کمال انسانی ہے۔

اگرچہ حکمت کو تعقل کے ساتھ اور شاعری کو تخیل کے ساتھ ایک نسبت ہے

مگر دونوں کو اور افعال ذہن کے ساتھ بھی کچھ تعلقات ہیں ان دونوں کے تعلقات میں قوائے ذہنی کے ساتھ بالحد گر فرق ہے اور اسی فرق کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر فضیلت ہے۔ اسی سے ایک یعنی فلسفہ علم ہے اور دوسری یعنی شاعری فن ہے، فلسفہ کو تعقل سے جو خاص نسبت ہے اس کے علاوہ بھی اور قوی سے بہت تعلق ہے اور شاعری کو تعقل سے بالکل کم تعلق ہے اور تخیل سے بہت زیادہ اور قوتوں سے بہت کم۔

فلسفہ اور شاعری کی غایتیں بھی بالکل مختلف ہیں فلسفہ کی غایت ذہن انسانی کی تکمیل ہے اور شاعری کی غایت ذہن انسانی یا تخیل کو خوش کرنا۔

ان دونوں کے فعل بھی جدا جدا ہیں فلسفہ ذہن انسانی کو تحقیق حق کی طرف رجوع کرتا ہے اور تلبیس اور مغالطہ سے اس کو نفرت ہے اور برخلاف اس کے شاعری کی بڑی صفت دھوکا دینا ہے اور اسی صفت کے اعتبار سے شاعری کو اکثر مصوری سے تشبیہ دیتے ہیں، جس طرح مصوری کی بڑی تعریف یہ ہے کہ وہ کسی چیز کی ایسی تصویر بنائے گا جس کے دیکھنے والے کو اصل چیز کا دھوکا ہو جائے۔ اسی طرح شاعر کی بڑی صفت یہ ہے کہ اس کا شعر سننے والے کے دل میں ایسی لذت یا ایسا لذت آمیز الم پیدا کرے کہ جس کے پیدا ہونے کی بظاہر کوئی وجہ نہ ہو۔

مگر مصوری اور شعر اگرچہ دونوں ہم کو دھوکا دیتے ہیں لیکن اُن کا اثر نہایت ہی مزہ کا ہے، شاعری اور مصوری جس چیز کا جلوہ دکھا کر ہم کو دھوکا دیتے ہیں وہ بجائے خود اور بذات خود نہایت دلپسند اور دل فریب ہے میری مراد خوبصورتی

سے ہے۔ اس لئے کہ مصوری خوبصورت کا نقل کرتا ہے کہ وہ نقل محسوس البصر ہو اور شاعری خوبصورت چیز کا بیان ہے کہ اس کا تصور دل میں پیدا کر دے۔

یہ تعریف موافق متقدمین کے لکھی گئی ہے، متاخرین نے اس تعریف کو اور بھی وسعت دی ہے اور ان کے نزدیک مصوری کسی چیز کی خواہ وہ کیسی ہی ہو نقل کرنا ہے کہ وہ نقل آنکھوں کو بھلی معلوم ہو اور شاعری کسی چیز کا خواہ وہ کیسی ہی ہو ایسا بیان ہے کہ وہ بیان دل کو خوش کرے۔
ہو نقل کرنا ہے کہ وہ بیان دل کو خوش کرے۔

ان دونوں تعریفوں کا فرق ان دو لفظوں سے خوب ذہن نشین ہو سکتا ہے کہ اگلے زمانے میں اگر کوئی بدصورت آدمی کسی مصور کے پاس آجاتا اور کہتا کہ میری تصویر بنا دے تو وہ کہتا کہ تیری تصویر کو کون بنائے جب تیری صورت دیکھنا کوئی پسند نہیں کرتا اور ویسا ہی ایک شخص اس زمانے میں کسی مصور کے پاس جائے اور کہے کہ میری تصویر بنا دے تو وہ یہ کہے گا۔ آیئے بسم اللہ اگرچہ آپ کی صورت کوئی دیکھنا پسند نہیں کرتا مگر میں آپ کی تصویر ایسی ہو بہو بنا دوں گا کہ سب اس کو بڑی خوشی سے دیکھیں گے۔

اگرچہ متاخرین کی تعریف بہت وسیع اور نہایت قابل قدر ہے مگر وہ نگاہ جس کو اچھی صورت کے دیکھنے کا چسکا ہو وہ اکثر صناع کے کمال اور فن کی باریکیوں کو نظر انداز کر کے اکثر انہیں تشبیہوں کو ڈھونڈتی ہے جن کے دیکھنے سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے کمال فن کے اعتبار سے متاخرین کا مقصد بہت عمدہ ہے لیکن غرض کے اعتبار سے متقدمین

کی تجویز بہت درست ہے۔

شیخ سعدی نے اس مضمون کو ایک شعر میں خوب ادا کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اچھی آواز اور اچھی صورت اپنی اپنی جگہ پر دونوں اچھی ہیں مگر وہ کیسا دلربا اور خوش ادا ہوگا جس میں یہ دونوں صفتیں جمع ہو جائیں۔

اس غایت پر نظر کر کے کسی فارسی والے نے کیا خوب شعر کہا ہے ؎

شعر گفتن بلکہ در سفتن بود
شعر فہمیدن بہ از گفتن بود

یہ شاعر فارسی شاید ان لوگوں میں تھا جنھوں نے شعر کو صرف فنون کے احاطہ میں اُس کے محدود ہونے کو پسند نہ کیا اور اس کو فلسفہ کے ایک شعبہ کو موضوع بنا دیا۔ میری مُراد اِس شعبہ سے ہے۔ جس کو اہل حکمت "حُب الجمال" یعنی اچھی صورت دیکھنے اور اُس کے پسند کرنے کا مذاق کہتے ہیں، اس شاعر نے کس عمدگی سے شعر کو حکمت کے مقاصد میں داخل کیا ہے اس نے کہا ہے کہ شعر جس حد تک کہ وہ ایک عملی صناعت ہے جس کو اس نے شعر گفتن سے تعبیر کیا ہے، حکمت میں داخل نہیں ہو سکتا اس لئے کہ حکمت صرف نظر کرنا ہے نہ عمل کرنا۔ پھر اس نے کہا کہ شعر فہمیدن یعنی الفاظ اور زبان کے ذریعہ سے جو مطالب اور مضامین ایسے ادا کئے جاتے ہیں کہ جن کا انسان کے دل اور دماغ پر خاص اثر ہے اس کا سمجھنا یا اس پر نظر کرنا اس فن سے بہتر ہے۔ پھر شعر کے فن ہونے کی کیا اچھی مثال دی، در سفتن موتی پرونا قطع نظر اس کے کہ ایک پیشہ ہے

بجائے خود عمدہ ہے اس لئے کہ گول شفاف چمکدار چیزوں سے ہر وقت کام رہتا ہے اور پھر یہ کام دشوار بھی ہے اسی طرح شعر کہنا بھی مشکل ہے مگر بایں ہمہ کہ وہ ایسا فن شریف اور لطیف ہے پھر بھی فہمیدن یعنی اس کے موضوع پر نظر کرنا اس سے عمدہ ہے اور نظر کرنا صرف صنعت نہیں ہو سکتا ہے اس لئے کہ صنعت میں شرط یہ ہے کہ شے مصنوع پیدا ہو اپنے اور دوسروں کے استعمال کے لئے۔

اختتام

امراؤ جان ادا

یہ عظیم ناول صرف ایک طوائف کی داستان ہی نہیں ہے بلکہ ہماری تہذیب و معاشرت اور عروج و زوال کا آئینہ ہے۔ یہ داستان ہماری تاریخ کا ایک ایسا ورق ہے جو آنکھ جھپکتے اُلٹ گیا ــــــ!

امراؤ جان ادا۔ اردو ادب کے افسانوی ادب میں ایک سنگ میل ہے یہ اس دور کی یادگار ہے جب اردو ناول دورِ جدید میں داخل ہو رہا تھا اس ناول کے خالق۔ مرزا ہادی رُسوا کے فن کا یہ اعجاز ہے کہ اس نے امراؤ جان کے کردار کو حیاتِ جاوید بخشی۔ یہ کردار امراؤ جان میں موجود تھا وہ ہماری سماج میں زندہ تھی چلتی پھرتی تھی لیکن ہم اُس سے کنی کاٹ جاتے تھے۔ وہ آج بھی زندہ ہے یہ اور بات ہے آج ہم سوسائٹی گرل کے روپ میں اُسے دیکھتے ہیں۔

مرزا نے شاہانِ اودھ سے لے کر طوائف کی زندگی تک ہر پہلو کی عکاسی اس طرح کی ہے جیسے وہ خود اس ناول میں بہ نفس نفیس شامل ہوں، اس ناول کے پلاٹ حیاتِ انسانی کے گہرے مطالعہ اور روزمرہ کی زندگی سے اخذ ہیں۔ اس ناول کی زبان میں غضب کی دلکشی ہے تحریر میں شوخی اور بیان میں شائستگی کے امتزاج نے منفرد اسلوب بنا دیا ہے۔

امراؤ جان ادا مرزا محمد ہادی رسوا کا شاہکار ہی نہیں بلکہ اردو ادب کا سب سے کامیاب ناول ہے جو فن کی کسوٹی پر بھی پورا اترتا ہے اور ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

ناول کے شروع میں ناول کے پس منظر اور پیش منظر پر ایک عالمانہ مقالہ بھی دیا گیا ہے۔

ISBN - 969 - 30 - 1029 - X